فہرست

شذرات	قربانی	منظور الحسن	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۷-۹)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی	بووالی سبزیاں	زاویۂ فراہی	۹
	اہل قدر کی دنیوی سزا	طالب محسن	۱۲
دین و دانش	قانون عبادات (۸)	جاوید احمد غامدی	۱۷
	ارکان حج کی حقیقت	الطاف احمد اعظمی	۲۲
حالات و وقائع	ہمارا اخلاقی بحران	ریحان احمد یوسفی	۴۳
	امام احمد بن حنبل	محمد رفیع مفتی	۶۰
وفیات	جناب ماجد خاور کی وفات	محمد احسن تہامی	۶۵
تبصرۂ کتب	''قبول حق کے بعد''	معظم صفدر	۶۷
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱
خبرنامہ			۷۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قربانی

متاع عزیز کو راہ خدا میں پیش کر دینا قربانی ہے۔ مال و دولت، عزیز و اقارب اور مسکن و وطن انسان کے لیے متاع بے بہا کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا ہدیہ بھی وہ پادشاہ ارض و سما کی نذر کرتا ہے، مگر دنیا میں اس کی سب سے بڑی متاع اس کی جان ہے۔ بندگی رب کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس اثاثۂ گراں مایہ کو حقیر نذرانہ سمجھ کر اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔ یہ تڑپ اگر ہے تو ایمان ہے، اگر نہیں ہے تو گویا انسان ایمان سے محروم ہے۔ چوپائے کی گردن پر چھری پھیر کر ایک مسلمان اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اگر میرے پروردگار نے جان کا مطالبہ کیا تو میں اسی طرح بصد شوق اپنا سر تن سے جدا کر کے اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رویاے صادقہ پر بعینہٖ عمل کو منشاے خداوندی سمجھتے ہوئے اپنے عزیز از جان فرزند کی گردن پر چھری رکھ کر اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنی گردن اللہ کے لیے پیش کر کے قربانی کے تصور کو بالکل مجسم اور ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ عیدالاضحی کے روز ہر مسلمان اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے اور اس کے تناظر میں گویا اپنے پروردگار سے یہ اقرار کرتا ہے کہ: ''میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے۔''

اس قربانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تاکہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں، ان پر وہ اس کا نام لیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو۔ اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے، اس پر صبر کرنے والے، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔''
> (الحج ۲۲: ۳۴-۳۵)

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قربانی من جملۂ عبادات ہے۔ انبیا کی امتوں میں یہ ہمیشہ مشروع رہی ہے۔ یہ خالص اللہ کے لیے ہے۔ اسے شرک کے شائبے سے بھی پاک ہونا چاہیے اور اسے اپنے آپ کو اپنے مالک کے حوالے کر دینے

کے جذبے سے انجام دینا چاہیے۔ جو لوگ اپنے گلے میں اللہ کی غلامی کا قلادہ ڈال لیتے ہیں، روح اور قالب، دونوں اپنے پروردگار کے سپرد کر دیتے ہیں، وہی مخبتین ہیں، وہی مومن ہیں اور انھی کے لیے اس جنت کی بشارت ہے جو خدا نے اپنے غلاموں کے لیے آباد کی ہے۔ان لوگوں کا عام سلوک یہی ہے کہ یہ رنج وراحت میں اپنے مالک کی یاد تازہ رکھتے ہیں، اس کے آگے سربہ سجود ہوتے ہیں اور اس کا دیا ہوا مال اسباب اس کی راہ میں نثار کرتے ہیں۔

قربانی کی یہی روح ہے جو انسان کے اندر تقویٰ کو پروان چڑھاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ محض جانور قربان کر کے گوشت اس کی نذر کر دیا جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس عمل سے تقویٰ بیدار کیا جائے۔ارشاد فرمایا ہے:

''اللہ کو تمھاری ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچے گا نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔''(الحج ۲۲: ۳۷)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ قربانی جو تمھیں پیش کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے، وہ اس لیے نہیں ہے کہ خدا کو ان قربانیوں سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ خدا کو ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا۔تمھاری پیش کی ہوئی یہ چیز تمھی کو لوٹا دی جاتی ہے۔تم خود اس کو کھاؤ اور بھوکوں اور محتاجوں کو کھلاؤ۔قربانی کی مثال بالکل یوں ہے کہ کوئی اپنے سر کے تاج کو اصل بادشاہ کے قدموں پر رکھے اور بادشاہ اس تاج کو اپنے قدموں سے عزت دے کر پھر اس کے سر پر پہنا دے...خدا قربانیوں کے خون سے محظوظ نہیں ہوتا، بلکہ اس تقویٰ اور اس اسلام و اخبات سے خوشنود ہوتا ہے جو ان قربانیوں سے ان کے پیش کرنے والوں کے اندر پیدا ہوتا ہے۔''(تدبر قرآن ۵/ ۲۴۴، ۲۵۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

چنانچہ قربانی کا اصل مقصد نہ احباب کو خوان نعمت میں شریک کرنا ہے، نہ تہوار کی تقریب کو دوبالا کرنا ہے اور نہ غریبوں کی مدد کرنا ہے، یہ فوائد ضمنی طور پر بلاشبہ اس سے حاصل ہو جاتے ہیں، مگر اس کا اصل مقصد تقویٰ کی نشوونما ہے۔ یہ مقصد اگر پیش نظر نہ رہے تو ہم بظاہر جانور ذبح کر کے فارغ ہو جاتے ہیں، مگر قربانی کی اصل روح سے غافل رہتے ہیں اور اس طرح اس عبادت سے ہمارے اندر تقویٰ کی آب یاری نہیں ہوتی۔

ـــــ منظور الحسن

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ، مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ، هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ، وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ، فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ، فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ

وہی ہے[5] جس نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے جس میں آیتیں محکم بھی ہیں جو اِس کتاب کی اصل بنیاد ہیں[6] اور (اِن کے علاوہ) کچھ دوسری متشابہات بھی ہیں[7]۔ سو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں[8]، وہ اِن میں سے

[۵] یعنی وہی عزیز وحکیم اور حی وقیوم جس کی ان صفات کا تقاضا تھا کہ وہ یہ کتاب اتارے اور اس کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد اس کے منکروں کو سزا دے۔

[۶] لفظ محکم یہاں متشابہ کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ آیتیں جن میں ایسے حقائق بیان کیے گئے جنھیں سمجھنا انسان کے لیے ممکن ہے، جو اس کے علم وعقل سے ماورا نہیں ہیں اور جن کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ قرآن کی زیادہ تر آیتیں یہی ہیں اور انھی پر اس کی ہدایت کا مدار ہے۔ قرآن نے اسی بنا پر انھیں ام الکتاب، یعنی کتاب کی اصل بنیاد قرار دیا ہے۔

[۷] اس سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کے صفات وافعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماورا اس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے، مثلاً آدم میں اللہ تعالیٰ کا اپنی روح پھونکنا یا سیدنا مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا کرنا یا جنت اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابۡتِغَـآءَ الۡفِتۡنَةِ، وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ، وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ، وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى

ہمیشہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں، اِس لیے کہ فتنہ پیدا کریں اور اِس لیے کہ اُن کی حقیقت معلوم

جہنم کے احوال ومقامات وغیرہ۔ وہ سب چیزیں جن کے لیے ابھی الفاظ وجود میں نہ آئے ہوں، انھیں تمثیل اورتشبیہ کے اسلوب ہی میں بیان کیا جاسکتا ہے۔کسی نادیدہ عالم کے حقائق دنیا کی سب زبانوں کے ادب میں اسی طرح بیان کیے جاتے ہیں۔آج سے دوصدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ انھیں آگ دکھانے کی ضرورت ہوگی۔متشابہ آیات کی نوعیت بالکل یہی ہے۔وہ نہ غیرمتعین ہیں اور نہ ان کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ان کے الفاظ عربی مبین ہی کے الفاظ ہیں اوران کے معنی بھی ہم بغیرکسی تردد کے سمجھتے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ان کی حقیقت ہم اس دنیا میں نہیں جان سکتے، لیکن اس جاننے یا نہ جاننے کا قرآن کے فہم سے چونکہ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کسی صاحب ایمان کو اس کے درپے بھی نہیں ہونا چاہیے۔استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں، وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے، اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل وتشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اوران کی اصل صورت وحقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔یہ باتیں خدا کی صفات وافعال یا آخرت کی نعمتوں اوراس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے، اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اوراس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اورصورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اوراس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اورنہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل وصورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔‘‘(تدبر قرآن ۲/۲۵)

[۸] اصل میں لفظ ’زیغ‘ استعمال ہوا ہے۔اس کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔استاذ امام لکھتے ہیں:

’’یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے: ایک کجی اور دوسرے سقوط۔کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں ’راسخون فی العلم‘ کی بیان ہوئی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الْـعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ: اٰمَنَّا بِهٖ ، كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٧﴾

کریں[9]، درآں حالیکہ اُن کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا[10]۔ (اِس کے برخلاف) جنھیں اِس علم میں رسوخ ہے[11]، وہ کہتے کہ ہم اِنھیں مانتے ہیں، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور (حقیقت یہ ہے۔

یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے، لیکن اہل کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے، اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔'' (تدبر قرآن ۲/۳۰)

[9] یہود و نصاریٰ کی گمراہی کی طرف اشارہ ہے۔ ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود فتنہ پیدا کرنے سے زیادہ دل چسپی رکھتے تھے اور نصاریٰ متشابہ آیات کی حقیقت جاننے سے۔ استاذ امام کے الفاظ میں یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں، اس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے، یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انھی کی طرف ہے۔

[10] اس آیت کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ متشابہات کے معنی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے لیے اصل میں 'تـاویل' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں یہ سورۂ یوسف (۱۲) کی آیت ۱۰۰ میں آیا ہے: 'قال : یابت، ھذا تاویل روء یای من قبل، قد جعلھا ربی حقا'' (اس نے کہا: اباجان، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچ کر دکھایا ہے)۔ یہ خواب جن لفظوں میں قرآن نے بیان کیا ہے، ان کے معنی ہر شخص پر واضح ہیں۔ عربی زبان کا ایک عام طالب علم بھی سورۂ یوسف کی اس آیت کا مفہوم، جس میں یہ خواب بیان ہوا ہے، بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتا ہے۔ لیکن سورج اور چاند اور ان گیارہ ستاروں کا مصداق کیا تھا جنھیں یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو سجدہ کرتے دیکھا، اس سے پوری قطعیت کے ساتھ کوئی شخص اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا تھا، جب تک یہ مصداق اپنی اصل صورت میں لوگوں کے سامنے نہ آ جاتا۔ متشابہ قرآن نے انھی چیزوں کو کہا ہے۔ اس کے معنی، جس طرح کہ لوگ بالعموم سمجھتے ہیں، مشتبہ اور مبہم کے نہیں ہیں کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کے لیے فرقان ہے، کسی حیثیت سے مجروح ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رَبَّنَا ، لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا ، وَهَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَا ، اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ ، اِنَّ اللّٰهَ لَايُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾

ہے کہ اِس طرح کی چیزوں کو) وہی سمجھتے ہیں جنھیں اللہ نے عقل عطا فرمائی ہے[۱۲]۔ (وہ کہتے ہیں): پروردگار، تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اِس کے بعد اب تو ہمارے دل نہ پھیر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ لاریب، تو ہی عطا فرمانے والا ہے۔ پروردگار، تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ایسے دن میں جمع کر کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا[۱۳]۔ ۷-۹

---

[۱۱] یعنی جن کے دلوں میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، جو انسان کے حدود کو سمجھتے اور اسی کے مطابق اپنے علم کے حدود متعین کرتے ہیں۔

[۱۲] یعنی جو لوگ علم میں رسوخ کے حامل ہیں، وہ محکمات اور متشابہات، دونوں کو اپنے پروردگار کا عطیہ سمجھتے اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام بھی لیتے ہیں۔

[۱۳] درحقیقت یہی یقین ہے جو انھیں ہرزہ گردی سے بچا کر ہمیشہ جادۂ مستقیم پر پابرجا رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے رسوخ فی العلم کا باعث بنتا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بو والی سبزیاں

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روي[1] أن النبي صلى الله عليه وسلم[2] أتي بقدر[3] فيه خضرات[4] من بقول. فوجد لها ريحًا[5]، فسأل. فأخبر بما فيها من البقول. فقال: قربوها. فقربوها[6] إلى بعض أصحابه كان معه. فلما رآه كره أكلها. قال: كل فإني أناجي من لا تناجي.

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دیگچی لائی گئی جس میں مختلف سبزیاں تھیں۔ آپ نے ان کی بو محسوس کی تو (ان کے بارے میں) معلوم کیا۔ ان سبزیوں کے بارے میں آپ کو بتایا گیا۔ آپ نے (انھیں کھانا پسند نہیں کیا اور) فرمایا: انھیں (ان صاحب کے) قریب کر دو۔ چنانچہ انھوں نے اسے آپ کے اصحاب میں سے ایک صحابی کے قریب کر دیا۔ جب انھوں نے اسے دیکھا تو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں) ان (سبزیوں) کو کھانا پسند نہیں کیا۔ (اس پر) آپ نے فرمایا: تم

کھاؤ، (میں تو اس لیے ان سے پرہیز کرتا ہوں، کیونکہ) میں ان[1] سے سرگوشی کرتا ہوں جن سے تم سرگوشی نہیں کرتے[2]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ 'مـن ' یہاں مفعول کے طور پر آیا ہے۔ اس سے مراد اسم 'اللہ' بھی ہو سکتا ہے اور اسم 'ملائکہ' بھی۔ ہمارے نزدیک یہاں 'ملائکہ' مراد ہے۔ یعنی وہ ملائکہ جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے موقع پر ہم کلام ہوتے تھے۔

۲۔ روایت سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بو والی سبزیاں نہیں کھائیں۔ اس کا سبب عبادت اور نزول وحی جیسے قرب الٰہی کے موقعوں پر پاس ادب ہے۔ صحابی کو آپ نے جس طرح انھیں کھانے کی ترغیب دی، اس سے واضح ہے کہ ان کا استعمال ہر لحاظ سے جائز ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۸۱۷ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۶۹۲۶۔ مسلم، رقم ۵۶۴، ابوداؤد، رقم ۳۸۲۲۔ بیہقی، رقم ۴۸۳۵، ۱۳۱۰۸۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۸۔

۲۔ امام بخاری اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں:

فـلا ادری ھـو مـن قول الـزھـری او فـی الحدیث. ”مجھے نہیں معلوم کہ یہ زہری کا قول ہے یا حدیث کا حصہ ہے۔“

۳۔ بخاری، رقم ۶۹۲۶ میں 'قـدر' (دیگچی) کے بجائے 'بـدر' (طباق) نقل ہوا ہے، جبکہ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۸ 'بشی ءٍ' (کوئی چیز) کا لفظ آیا ہے۔

۴۔ بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۳۱۰۸ میں 'خـضـرات' (سبزی) کے بجائے اس کی جمع 'خـضـروات' (سبزیاں) آئی ہے، جبکہ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۸ میں 'أخضران' (سبزی) نقل ہوا ہے۔

۵۔بعض روایات مثلاً نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۸۸ میں 'فوجد لھا ریحا' (آپ نے ان کی بو محسوس کی) کے بجائے 'فوجد بھا ریحا' (آپ نے ان میں بو محسوس کی) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۶۔'فقربوھا' (چنانچہ انھوں نے اسے قریب کر دیا) کے الفاظ بخاری، رقم ۶۹۲۶ میں روایت ہوئے ہیں۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طالب محسن

اہل قدر کی دنیوی سزا

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۱۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن نافع أن رجلا أتى ابن عمر. فقال: إن فلانا يقرأ عليك السلام. فقال: إنه بلغني أنه قد أحدث، فإن كان أحدث فلا تقرئه مني السلام. فإني سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: يكون في أمتي —— أو في هذه الأمة —— خسف أو مسخ أو قذف في أهل القدر.

''حضرت نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا: فلاں آدمی نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ انھوں نے کہا: مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس نے دین میں نئی بات نکالی ہے۔ پھر اگر اس نے واقعی نئی بات نکالی ہے تو میری طرف سے اسے سلام نہ پہنچانا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں —— یا اس امت میں —— زمین میں دھنسنے یا شکلوں کے بگڑنے یا سنگ باری (کے عذاب) اہل قدر پر آئیں گے۔''

لغوی مباحث

أحدث: نئی بات نکالی۔ یعنی دین میں بدعت پیدا کی۔ کسی ایسی رائے یا عمل کو دین قرار دینا جو دین میں نہ ہو۔

خسف: زمین میں دھنسنا۔ یہ پچھلی قوموں پر آنے والے عذابوں میں سے ایک ہے۔

مسخ: شکلوں کا بگڑ جانا۔ جیسے یہود میں سے ایک گروہ کو بندر بنا دیا گیا تھا۔

قذف: سنگ باری ہونا۔ یعنی ایسے طوفان کا آنا جس میں ہوا پتھروں کو اٹھا لائے اور کسی قوم پر برسا دے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے عذابوں میں سے ایک ہے۔

متون

یہ روایت ابن ماجہ سے لی گئی ہے۔ یہ پیش نظر نسخے کی روایت اور مشکوٰۃ میں ثبت روایت میں بعض لفظی فرق ہیں اور اس وجہ ابن ماجہ کے مختلف نسخوں میں فرق ہے۔ ترمذی میں اس روایت کے دو متن ہیں۔ ایک متن میں محض لفظی فرق ہے۔ محولہ روایت میں پہلا جملہ: 'حدثني أن ابن عمر جاءه رجل' کے الفاظ میں ہے، جبکہ ترمذی میں یہ جملہ 'أن ابن عمر جاءه رجل' کے الفاظ میں ہے۔ اسی طرح اس روایت میں امت والے جملے میں راوی کا تردد محض دو متبادل جملوں کے نقل کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے، جبکہ ترمذی میں اس کے لیے 'الشك منه' کے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسرے متن میں سلام نہ بھیجنے والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف مکذبین قدر کے لیے خسف و مسخ کی سزا کا ذکر ہوا ہے۔ ایک تبدیلی یہاں بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں قذف کا ذکر نہیں ہے۔

ابوداؤد کا متن اس روایت سے بالکلیہ مختلف ہے۔ ابوداؤد کی مکمل روایت حسب ذیل ہے:

عن نافع قال: كان لإبن عمر صديق من أهل الشام، يكاتبه . فكتب إليه عبد الله بن عمر إنه بلغني أنك تكلمت في شيء من القدر . فإياك أن تكتب إلى فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنه سيكون في أمتي أقوام يكذبون بالقدر. (ابوداؤد، رقم ۳۹۹۷)

''حضرت نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک شامی دوست تھا۔ ان کے مابین خط کتابت ہوتی تھی۔ ایک موقع پر عبداللہ بن عمر نے اسے لکھا: مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم نے تقدیر کے بارے میں کچھ (شک) ظاہر کیا ہے۔ (آیندہ) مجھے خط لکھنے سے پرہیز ہی کرنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جلد ہی میری امت میں ایسے لوگ (پیدا) ہوں گے جو تقدیر کا انکار کریں گے۔''

یہ روایت اصل معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کو کیوں ترجیح نہیں دی۔ قرین قیاس یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار تقدیر کے بارے میں صرف اتنی بات ہی کہی ہو گی۔ باقی سب کچھ وقتی مناظرانہ ضرورتوں کے تحت بڑھا لیا گیا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شامی دوست سے متعلق بھی اسی روایت کی بات ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے سلام بھیجا ہو اور ابن عمر نے سلام کے جواب سے انکار بھی کیا ہو، لیکن اگلی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔

معنی

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں یہ بیان ہوا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو کسی نے سلام بھیجا تو انھوں نے اسے جواب میں سلام نہیں بھیجا۔ اس لیے کہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ وہ تقدیر پر ایمان میں شکوک و شبہات ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے استشہاد کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل ہوا ہے۔

سلام اور اس کا جواب نہ دینے کا عمل، ابن عمر کی طبعی شدت کا ایک مظہر ہے۔ ان کی سیرت کے مطالعے سے ان کی طبیعت کا یہ پہلو بہت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ شارحین نے اس کی تصویب کی ہے اور اسے بدعتی سے عدم تعلق کے تحت لیا ہے۔ یہ بات کہ بدعتی سے سلام کا تعلق بھی منقطع کر لیا جائے، محل نظر ہے۔ ہمارے علم کے مطابق تقدیر کے بارے میں یہ بحثیں دور صحابہ ہی میں شروع ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ یقیناً دوسرے صحابہ کو بھی واسطہ پڑا ہے، لیکن اس طرح کا ردعمل کسی دوسرے صحابی کی نسبت سے بیان نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں یہ بحثیں زیادہ شدت سے ہوئیں اور علما نے ان لوگوں سے مقاطعہ کی روش نہیں اپنائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ، آخرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا اور کتاب و سنت کو دین کا ماخذ مانتا ہے، اس سے مقاطعے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرز عمل کی مثالیں تو شاید ہمیں ہر دور میں مل جائیں، لیکن امت نے بحیثیت جماعت اسے کبھی اختیار نہیں کیا۔

منکرین تقدیر کے لیے عذاب کی پیش گوئی الگ بھی روایت ہوئی ہے اور اسے الگ روایت کی حیثیت سے صاحب مشکوٰۃ نے بھی نقل کیا ہے۔ روایت ۱۰۶ کے تحت اس کی شرح لکھتے ہوئے ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس میں بیان کیے گئے جرم اور سزا میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان عذابوں کا ذکر منکرین رسالت کے حوالے سے ہوا ہے۔

اس حوالے سے تین باتیں اور بھی قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ خسف و قذف کے حوادث قرب قیامت میں پیش آئیں گے۔ ان روایات میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ عمومی اخلاقی زوال کو اس کا سبب

بتایا گیا ہے۔اسی طرح ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا بھی مذکور ہے کہ آپ نے اپنی امت سے چار عذابوں کے اٹھانے کی دعا کی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا دو کے حق میں قبول ہوئی۔یعنی قذف اور خسف کی سزائیں اس امت پر نہیں آئیں گی۔اگر یہ روایات درست ہیں تو پھر خسف وقذف کے حوالے سے زیر بحث روایت کا جملہ موزوں نہیں ہے۔اس میں جس قطعیت کے ساتھ ان عذابوں کو منکرین تقدیر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، وہ محل نظر ہے۔دوسرے یہ کہ وہ دور جس میں مرجۂ اور قدریہ گروہ بڑی شدومد سے یہ مسائل زیر بحث لا رہے تھے،گزر گیا ہے۔منکرین قدر میں سے کسی کے ساتھ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پیش گوئی کی ہو اور وہ پوری نہ ہو۔تیسرے یہ کہ ابوداؤد کی روایت اس ساری بات کی ایک مختلف تصویر پیش کرتی ہے۔اس میں پیشین گوئی بھی بالکل مختلف ہے۔وہ پیشین گوئی اپنی پوری صحت کے ساتھ پوری ہو چکی ہے۔کیوں نہ اسی روایت کو اصل کی حیثیت سے مانا جائے اور ان اضافوں کو مناظرانہ تجاوزات کا شاخسانہ سمجھا جائے۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۲۰۷۸، ۲۰۷۹۔ ابوداؤد، رقم ۳۹۹۷۔ ابن ماجہ، رقم ۴۰۵۱۔ دارمی، رقم ۳۹۳۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۸)

نماز میں غلطی

نماز کے لیے جو اعمال و اذکار شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں، ان میں کوئی غلطی ہو جائے یا شبہ ہو کہ غلطی ہوئی ہے تو یہ سنت قائم کی گئی ہے کہ غلطی کی تلافی کرنا ممکن ہو تو تلافی کے بعد اور ممکن نہ ہو تو اس کے بغیر ہی نماز کے آخر میں دو سجدے زیادہ کر لیے جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات اس طرح کے جو واقعات ہوئے اور آپ نے جس طریقے سے سہو کے یہ سجدے کیے، ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

ابن بحینہ کہتے ہیں کہ حضور نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی، لیکن پہلی دو رکعتوں کے بعد قعدہ نہیں کیا اور اس کے بغیر ہی تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ لوگ بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ نماز پوری ہونے کو تھی اور لوگ سلام کے منتظر تھے کہ آپ نے تکبیر کہی اور سلام سے پہلے دو سجدے کیے، پھر سلام پھیر دیا۔[۲۴۳]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھا دی۔ عرض کیا گیا: کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ فرمایا: کیوں، کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا: آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں۔ اس پر حضور نے وہیں بیٹھے ہوئے پاؤں موڑے، قبلہ کی طرف منہ کیا اور دو سجدے کر کے سلام پھیر دیا۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور

۲۴۳؎ بخاری، رقم ۱۱۶۶، ۱۱۶۷۔

فرمایا: نماز کے معاملے میں کوئی نیا حکم ہوتا تو میں تمھیں بتا دیتا۔ بات یہ ہے کہ میں بھی تمھاری طرح انسان ہی ہوں۔ جس طرح تم بھولتے ہو، میں بھی بھول جاتا ہوں۔ لہٰذا بھول جاؤں تو یاد کرا دیا کرو۔ اور یاد رکھو کہ تم میں سے کسی کو نماز میں شبہ ہو تو وہ صحیح بات کا اندازہ کرے، پھر اسی کے لحاظ سے نماز پوری کرے، پھر سلام پھیرے اور اس کے بعد دو سجدے کر لے۔[۲۴۴]

ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی نماز دو رکعت پڑھی اور سلام پھیر دیا۔ مسجد کے اگلے حصے میں ایک لکڑی رکھی ہوئی تھی۔ آپ گئے اور کچھ غصے کے عالم میں اس پر ٹیک لگا دی۔ لوگوں میں ابوبکر و عمر بھی تھے، لیکن آپ کی ہیبت سے بات نہیں کر سکے۔ اتنے میں کچھ جلد باز لوگ مسجد سے نکلے اور کہنا شروع کر دیا کہ نماز کم ہو گئی ہے۔ اس پر ایک صاحب جنھیں ذوالیدین کہا جاتا تھا، اٹھے اور انھوں نے ہمت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ بھول گئے یا نماز کم کر دی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہ بھولا ہوں اور نہ نماز کم ہوئی ہے۔ انھوں نے عرض کیا: کچھ تو ہوا ہے، یا رسول اللہ۔ آپ نے لوگوں سے تصدیق چاہی۔ انھوں نے بھی یہی کہا تو آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر سلام پھیرا، پھر تکبیر کہی اور اپنے معمول کے مطابق یا اس سے کچھ لمبا سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی۔ پھر تکبیر کہی اور اپنے معمول کے مطابق یا اس سے کچھ لمبا سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی۔[۲۴۵]

عمران بن حصین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی اور تین رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا، پھر اپنے حجرے میں چلے گئے۔ ایک شخص جسے خرباق کہتے تھے اور جس کے ہاتھ بہت لمبے تھے، اس نے آپ کو بتایا۔ آپ غصے میں اپنی چادر کھینچتے ہوئے باہر تشریف لائے اور لوگوں سے پوچھا: یہ سچ کہتا ہے؟ انھوں نے تصدیق کی تو آپ نے ایک رکعت پڑھی، پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کیے اور اس کے بعد دوبارہ سلام پھیر دیا۔[۲۴۶]

معاویہ بن حدیج کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر جب اس طرح چھوٹی ہوئی رکعت ادا کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ مسجد میں آئے تو آپ کی ہدایت پر بلال نے اس کے لیے اقامت بھی کہی۔[۲۴۷]

آپ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے کسی کو نماز میں شبہ ہو جائے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو اسے چاہیے کہ یقین پر بنا رکھے اور جس میں شبہ ہو،

۲۴۴؎ بخاری، رقم ۳۹۲،۱۱۶۸۔

۲۴۵؎ بخاری، رقم ۱۱۷۲۔ مسلم، رقم ۵۷۳۔

۲۴۶؎ مسلم، رقم ۵۷۴۔

۲۴۷؎ نسائی، رقم ۶۶۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اُسے چھوڑ دے، پھر سلام سے پہلے دو سجدے کر لے۔ اس نے پانچ رکعتیں پڑھ لیں تو یہ سجدے انھیں جفت کر دیں گے اور چار پوری کر دیں تو شیطان کے لیے باعث ذلت ہو جائیں گے۔[۲۴۸]‘

امام غلطی کرے اور اس پر خود متنبہ نہ ہو تو مقتدی اسے متنبہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ ’سبحان اللّٰہ‘ کہیں گے۔ عورتیں اپنی آواز بلند کرنا پسند نہ کریں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر متنبہ کر دیں۔[۲۴۹] اسی طرح فرمایا ہے کہ قرأت میں غلطی ہو جائے تو سننے والے امام کو یاد دلا دیں گے۔[۲۵۰]

نماز کے آداب

نماز اللہ تعالیٰ کی پرستش اور اس کے حضور میں دعا و مناجات ہے۔ چنانچہ قرآن نے جہاں اس کی حفاظت کا حکم دیا ہے، وہاں یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ: ’وقوموا للّٰہ قانتین‘[۲۵۱] (اور اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہدایات اس حکم کی وضاحت میں نقل ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ نماز میں کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی جائے۔ فرمایا ہے: نماز تو صرف تسبیح و تکبیر اور قرآن کی تلاوت ہے، اس میں لوگوں کی بات چیت کی قسم کی کوئی چیز جائز نہیں ہے۔[۲۵۲] زید بن ارقم کہتے ہیں کہ ہم پہلے نماز میں اپنے ساتھ کے نمازی سے کوئی بات کر لیتے تھے، لیکن ’وقوموا للّٰہ قانتین‘ کا حکم نازل ہوا تو ہمیں اس سے روک دیا گیا اور خاموشی کے ساتھ نماز پڑھنے کی ہدایت کی گئی۔[۲۵۳] ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تو آپ جواب دیتے تھے، لیکن نجاشی کے ہاں سے واپسی پر ہم نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ، آپ نماز میں سلام کا جواب دیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: نماز میں ایک ہی مشغولیت ہو سکتی ہے۔[۲۵۴]

۲۔ نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے

---

۲۴۸ مسلم، رقم ۵۷۱۔

۲۴۹ بخاری، رقم ۶۵۲، ۱۱۴۵۔ مسلم، رقم ۴۲۲۔

۲۵۰ ابوداؤد، رقم ۹۰۷۔

۲۵۱ البقرہ ۲: ۲۳۸۔

۲۵۲ مسلم، رقم ۵۳۷۔

۲۵۳ مسلم، رقم ۵۳۹۔

۲۵۴ مسلم، رقم ۵۳۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ شیطان کا بندے کی نماز میں سے جھپٹ لینا ہے۔[255] اسی طرح آسمان کی طرف دیکھنے پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تنبیہ فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: لوگوں کا کیا معاملہ ہے کہ نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔ وہ اس سے باز آ جائیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔[256]

۳۔ نماز پورے سکون کے ساتھ پڑھی جائے۔ ارشاد فرمایا ہے: یہ کیا بات ہے کہ میں تمھیں اس طرح ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہوں جس طرح سرکش گھوڑوں کی دمیں اٹھتی ہیں، نماز میں پر سکون رہا کرو۔[257]

۴۔ نماز کے دوران میں بال اور کپڑے نہ سمیٹے جائیں۔ آپ کا ارشاد ہے: مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں سات اعضا پر سجدہ کروں اور نماز کے دوران میں اپنے بال اور کپڑے نہ سمیٹوں۔[258]

۵۔ نمازی کے سامنے کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے حضور قلب میں فرق آئے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ نے گھر میں ایک پردہ لٹکا رکھا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: یہ پردہ ہٹا دو، اس لیے کہ اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے آتی رہیں گی۔[259]

۶۔ کھانا سامنے رکھا ہو تو اس سے فارغ ہو کر اطمینان کے ساتھ نماز پڑھی جائے تاکہ نماز میں کھانے کا خیال نہ ہو، بلکہ کھانے کے دوران میں آدمی نماز کے دھیان میں رہے۔ یہی ہدایت اس صورت میں بھی ہے، جب پیشاب یا پاخانے کے لیے جانے کی ضرورت ہو۔ ارشاد فرمایا ہے: کھانا سامنے ہو یا پیشاب یا پاخانہ لگ رہا ہو تو نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔[260]

۷۔ نماز کے دوران میں کوئی دوسرا کام کرنا ہی پڑے تو اس میں افراط نہ ہو۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص سجدے کی جگہ مٹی برابر کر رہا تھا، آپ نے دیکھا تو فرمایا: تمھیں کرنا ہی ہے تو ایک مرتبہ کر لو۔[261]

۸۔ قیام کی حالت میں کوئی شخص پہلو پر ہاتھ رکھے، نہ قعدے میں بغیر کسی ضرورت کے ہاتھوں کا سہارا لے کر بیٹھے۔ نبی

---

۲۵۵ بخاری، رقم ۷۱۸۔

۲۵۶ بخاری، رقم ۷۱۷۔ مسلم، رقم ۴۲۹۔

۲۵۷ مسلم، رقم ۴۳۰۔

۲۵۸ بخاری، رقم ۷۸۳۔ مسلم، رقم ۴۹۰۔

۲۵۹ بخاری، رقم ۳۶۷۔

۲۶۰ مسلم، رقم ۵۶۰۔

۲۶۱ بخاری، رقم ۱۱۴۹۔ مسلم، رقم ۵۴۶۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔[262]

۹۔نماز میں جماہی نہ لے۔آپ کا ارشاد ہے: تم میں سے کسی کو نماز میں جماہی آ جائے تو جہاں تک ممکن ہو، اسے روکنے کی کوشش کرے، ورنہ منہ پر ہاتھ رکھ لے۔[263]

۱۰۔شایستہ اور مناسب لباس پہن کر نماز پڑھے۔حضور کا ارشاد ہے کہ ایک ہی کپڑا ہو تو اس طرح نہیں اوڑھنا چاہیے کہ اس کا کچھ حصہ کندھوں پر نہ ہو۔[264] اسی طرح فرمایا ہے کہ بالغ عورتیں اوڑھنی لیے بغیر نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرتے۔[265]

[باقی]

۲۶۲؎ بخاری، رقم ۱۱۶۱۔ مسلم، رقم ۵۴۵۔ ابوداؤد، رقم ۹۴۷۔

۲۶۳؎ مسلم، رقم ۲۹۹۵۔

۲۶۴؎ مسلم، رقم ۵۱۶۔

۲۶۵؎ ابوداؤد، رقم ۶۴۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الطاف احمد اعظمی

ارکان حج کی حقیقت

حج اسلامی عبادات کا ایک اہم رکن ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ سب سے بڑا رکن ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو اس امر میں تردد تھا کہ حج سب سے بڑی عبادت ہے، لیکن جب انھوں نے حج کیا تو ان کا یہ تردد دور ہو گیا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ حج واقعی سب سے بڑی عبادت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حج کی اس زبردست اہمیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں کل عبادات جمع ہیں۔ دیکھیں، اس میں نماز بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور روزہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس عبادت کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موحدانہ زندگی کے ایک اہم واقعے سے ہے، یعنی واقعۂ ذبح۔ ان وجوہ سے حج کو اسلام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دیگر عبادات کی طرح یہ عظیم الشان عبادت بھی اب پورے طور پر بے اثر ہو چکی ہے۔ ہر شخص بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ حج کر لینے کے باوجود مسلمانوں کی زندگی میں ابراہیمی فکر ونظر کی نمود تو بڑی بات ہے، تقویٰ کی معمولی جھلک بھی جو تمام عبادات کا مقصود ومطلوب ہے، دیکھنے کو نہیں ملتی۔

حج کی اس بے اثری کی متعدد وجہیں ہیں جن میں سے ایک بڑی وجہ ارکان حج کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ مثلاً اکثر حجاج کرام خواندہ اور ناخواندہ، دونوں یہ نہیں جانتے کہ احرام کا لباس کیوں پہنتے ہیں، تلبیہ کی صدا کیوں بلند کرتے ہیں، کعبہ کے گرد طواف کیوں کرتے ہیں وغیرہ؟ ان دنوں حج کی بے اثری کی ایک بڑی وجہ یہی ناآشنائی ہے۔ علما کی طرف سے اعمال حج کی جو توجیہات پیش کی گئی ہیں، وہ راقم کے نزدیک حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً رمی کے عمل کو مجسم شیطان پر لعنت قرار دینا۔ یہی معاملہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا ہے۔ اس کی تاویل بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ان وجوہ سے ہم نے خیال کیا کہ ارکان حج کی صحیح حقیقت معلوم کی جائے اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے تاکہ حج جیسی عظیم عبادت کے فیوض وبرکات سے مسلم معاشرہ بہرہ ور ہو۔

احرام

یہ دو بن سلی ہوئی چادریں ہیں، جن کو حاجی حدود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک متعین مقام میقات پر پہنتا ہے۔ معلوم ہے کہ نفیس لباس مرغوبات نفس میں شامل ہے اور حج کا بنیادی مقصد مرغوبات نفس کی اسیری سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ایک حاجی جس وقت اپنا پسندیدہ لباس اتار کر احرام جیسا سادہ اور معمولی لباس پہنتا ہے تو اس سے جہاں نفس کی مخالفت ہوتی ہے اور غرور و تکبر پر جو نفس انسانی کی ایک بڑی خرابی ہے، ضرب پڑتی ہے اور طبیعت میں عاجزی اور خاکساری پیدا ہوتی ہے، وہاں اس عمل سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ حاجی نفس کا بندہ و غلام نہیں، بلکہ خدائے قدوس کا بندہ و غلام ہے۔ ابن خلدون نے اپنے ''مقدمہ'' میں لکھا ہے:

> ''احرام کی سلائی جو ممنوع ہوئی تو اس کا راز یہی ہے کہ حج کی غرض و غایت دنیوی بکھیڑوں سے رشتہ توڑ کر خدا کی طرف رجوع کرنا ہے، یہاں تک کہ انسان کا دل تکلفات کی ہر چیز سے کٹ کر اپنی لو صرف خدا سے لگا لے، نہ خوشبو استعمال کرے، نہ عورت سے خلا ملا رکھے، نہ سلا ہوا کپڑا پہنے، نہ موزہ پہنے اور نہ شکار کی طرف توجہ کرے، غرض یہ کہ نفس کی خواہشات و مرغوبات سے مکمل قطع تعلق کر لے۔'' (۴۳۷)

عمدہ لباس، سماجی حیثیت کے اظہار و امتیاز کا بھی ہمیشہ سے ایک بڑا ذریعہ رہا ہے۔ احرام دولت مندی کی اس نشانی اور سماجی امتیاز کی اس علامت کو ختم کر کے تمام عازمین حج کو برابری کے رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ حجاج کرام خواہ وہ کسی ملک و علاقہ سے آئے ہوں، ایک ہی یونیفارم (احرام) میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اب نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی غریب، نہ کوئی حاکم ہے نہ کوئی محکوم، سب خدا کے بندے ہیں اور اس حیثیت سے خدا کی نگاہ میں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے بدویانہ زندگی پسند کی تھی۔ بابل جیسے متمدن ملک سے ہجرت کر کے آپ نے ایک نہایت غیر متمدن علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ احرام اس بدویانہ زندگی کی یاد دلاتا ہے کہ کبھی اسی بن سلے ہوئے لباس کو پہن کر جد امجد نے مکہ کی سرزمین میں قدم رکھا تھا اور خدائے واحد کی عبادت کی تھی۔ اس سے ایک حاجی کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ لباس کے تکلفات سے ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کر کے سادہ لباسی کو اپنا ملی شعار بنائے۔

تلبیہ

احرام کا لباس زیب تن کرتے ہی درج ذیل الفاظ کا ورد شروع ہو جاتا ہے:

لبيك ، اللّٰهم لبيك ، لبيك ، لا شريك لك، لبيك . ان الحمد والنعمة لك	''حاضر ہوں، اے اللہ حاضر ہوں۔ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں۔ سب تعریف تیرے لیے اور

والملك لا شريك لك .(مسلم، کتاب الحج۔ موطا، کتاب الحج)

سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور بادشاہی میں تیرا کوئی شریک نہیں۔‘‘

اس ورد کو اصطلاح حج میں تلبیہ کہتے ہیں۔اس کے لفظی معنی ہیں: لبیک کہنا، پکار کا جواب دینا۔ یہاں سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ کس پکار کا جواب ہے، اور یہ پکار کیوں لگائی گئی تھی؟ ہم لکھ چکے ہیں کہ جس وقت خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ وہ اس گھر کے حج کی منادی کر دیں[1]۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے حج کا یہ اعلان تقریباً چار ہزار سال پہلے مکہ کی پہاڑیوں کے اوپر سے ہوا تھا۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صدا کل ہی بلند ہوئی ہے اور لوگ جوق در جوق اس پکار کے جواب میں خدا کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔تلبیہ دراصل ابراہیمی پکار کا جواب ہے۔روایات میں آتا ہے کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ لوگوں سے پکار کر کہہ دو کہ وہ اس گھر کے حج کے لیے آئیں تو آپ نے فرمایا:

يا رب كيف أبلغ الناس وصوتي لا ينفذهم فقال ناد ، وعلينا البلاغ . فقام على الحجر و قال، يا ايها الناس ان ربكم قد اتخذ بيتا فحجوه . (تفسیر ابن کثیر۳/۲۱۶)

’’اے رب، میں یہ بات کیسے لوگوں تک پہنچاؤں۔میری آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔اللہ نے کہا، تم پکارو، اس پکار کو لوگوں تک پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔پس حضرت ابراہیم پتھر پر کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو، تمھارے رب نے ایک گھر کو مقرر کیا ہے، پس تم اس کا حج کرو۔‘‘

سبحان اللہ، اس صداے دل نواز کا بلند ہونا تھا کہ زمین کے فاصلے سمٹ گئے، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلوں کی قدرتی رکاوٹیں گویا درمیان سے ہٹ گئیں اور دنیا کے گوشے گوشے تک یہ ربانی پیغام پہنچ گیا۔اور اس شان سے پہنچا کہ آج تک دنیا کے ہر کونے سے، ہر بلندی اور پستی سے اور ہر خشکی اور تری سے ’’حاضر ہوں‘‘ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور بلا کشان محبت کے قافلہ ہاے تیز گام اس پیغام کے مرکز کی طرف کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر آستان الٰہی پر جبین نیاز جھکائیں اور اس کی غلامی کے داغ سے اپنی پیشانی کو آراستہ کریں۔

تلبیہ دراصل حاجی کا روحانی ترانہ ہے اور جس وقت ایک جم غفیر یہ ترانۂ جاں نواز پڑھتا ہے تو اس سے ایک ایسا روحانی ماحول پیدا ہوتا ہے کہ قلوب خود بخود خدا کی اطاعت و بندگی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں اور تسلیم و رضا کے جذبات اس درجہ غالب آ جاتے ہیں کہ دل و دماغ میں کسی اور جذبہ و خیال کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔عشق و محبت کے اس زمزمۂ جنوں انگیز کو سن کر ممکن ہی نہیں کہ دل کی دنیا میں کوئی ہنگامہ نہ ہو اور سفینۂ حیات جذبات محبت کی تلاطم خیزی میں ہچکولے نہ کھانے لگے۔’’حاضر ہوں، حاضر ہوں‘‘ کی پرجوش صداؤں سے عالم ناسوت تو کیا عالم لاہوت بھی گونج اٹھتا ہوگا، اور فرشتے محبت الٰہی کا یہ عدیم

---

[1] واذن فى الناس بالحج ...عميق۔(الحج ۲۲:۲۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

المثال منظر دیکھ کر یقیناً آئینۂ حیرت بن جاتے ہوں گے۔

طواف کعبہ

حدود حرم میں قدم رکھتے ہی حاجی اس گھر کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اس کے سفر کی منزل مقصود ہے۔ یعنی خانۂ کعبہ جو خدا کا پہلا گھر ہے اور جس کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جیسی خدا کی برگزیدہ اور مقدس ہستیوں کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ دراصل قربان گاہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ. (البقرہ ۲:۱۹۶)	''اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک کہ ہدی (قربانی) اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔''

قرآن مجید کی تصریح کے مطابق یہ محل 'بیت عتیق' ہے۔ فرمایا ہے:

لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ. (الحج ۲۲:۳۳)	''اور تمھارے لیے ان ہدی کے جانوروں میں ایک متعین مدت تک مختلف قسم کے فائدے ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر نام لے کر اس قدیم گھر کا ذکر بحیثیت قربان گاہ کیا گیا ہے:

يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ هَدۡيًا بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ. (المائدہ ۵:۹۵)	''جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر آدمی کریں گے۔ یہ (یعنی بدلے کا جانور) نیاز کی حیثیت سے خانۂ کعبہ کو پہنچایا جائے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جب مکہ کی آبادی بڑھ گئی اور حاجیوں کی کثرت ہوئی تو اس قربان گاہ کو منیٰ تک وسیع کر دیا گیا، لیکن اس کا معنوی رشتہ خانۂ کعبہ سے قائم رکھا گیا۔ چنانچہ منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی فوراً ہی مکہ پہنچ کر اصلی قربان گاہ یعنی خانۂ کعبہ کا طواف کرتا ہے جو طواف زیارت کے نام سے موسوم ہے، اور یہ لازمی ہے۔ اس عمل سے ثابت ہوا کہ خانۂ کعبہ قربان گاہ بھی ہے۔

تاریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہودیوں میں نذر و قربانی کے لیے ایک ضروری شرط یہ تھی کہ اس کو مذبح کے سامنے سات مرتبہ پھیرا جائے[۲]۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ خداوند کے حضور یعنی بیت اللہ کے سامنے لائی جائے[۳]۔

خانۂ کعبہ کے گرد طواف کے سات پھیرے اور اس میں رمل دراصل ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ طریقۂ نذر و قربانی کی نقل ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد سات پھیرے لگا کر حاجی دراصل اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کو خدا کی نذر کر چکا ہے، اس

---

۲ گنتی ۶:۵، ۹۔

۳ احبار ۸:۲۷، ۱۴، ۲۱، ۲۴۔ خروج ۲۹:۲۶۔

کا جینا ومرنا سب اسی کے لیے ہے۔

افسوس کہ آج اکثر حاجی طواف کی اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور بے سوچے سمجھے کسی طرح سات پھیرے پورے کر دیتے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا تو بڑی بات ہے، اکثر لوگ حج سے فراغت کے بعد اس طرح آزاد و خودمختار ہو جاتے ہیں گویا انھوں نے خانۂ کعبہ کے گرد طواف کر کے خود کو اللہ کے حوالے کیا ہی نہیں تھا۔

حجر اسود کا استلام

حجر اسود، ناہموار، مگر چمک دار سیاہ سرخی مائل، بیضوی شکل کا ایک پتھر ہے جو چاندی کے خول میں خانۂ کعبہ کے ایک گوشے میں کچھ بلندی پر نصب ہے[۴]۔ یہ پتھر نہایت قدیم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہزاروں سال پہلے جس گھر کی تعمیر کی تھی، اس گھر کا صرف یہی ایک پتھر آج باقی رہ گیا ہے جو برابر اس کی قدامت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اسی پتھر کو لبوں یا ہاتھوں سے مس کر کے خانۂ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ یقیناً اس پتھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقدس لبوں نے بوسہ دیا ہوگا اور خود ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اپنے پاکیزہ ہاتھوں اور لبوں سے اس کو چھوا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک امت مسلمہ کے بے شمار صلحا و اتقیا نے اس عمل کو جاری رکھا اور انشاءاللہ ابدالآباد تک یہ حسین عمل جاری رہے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کا طواف شروع کرنے سے پہلے اس پتھر کو بوسہ کیوں دیا جاتا ہے یا اسے ہاتھوں سے کیوں چھوا جاتا ہے؟ یہ بات طے ہے کہ وہ نفع وضرر پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت عمر فاروق نے ایک بار دوران طواف میں اس پتھر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں تجھ کو صرف اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ہرگز بوسہ نہ دیتا[۵]۔ موطا کے الفاظ ہیں:

انما انت حجر ولولا انی رأیت رسول اللّٰہ قبلك ما قبلتك ثم قبله. (موطا، کتاب الحج)

---

[۴] دور جاہلیت میں خانۂ کعبہ کو آگ لگ گئی تو یہ پتھر بھی جھلس گیا تھا۔ ۶۴ ہجری میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کی فوجوں میں لڑائی کے نتیجے میں یہ پتھر تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ابن زبیر نے چاندی کے موٹے خول کے اندر ان ٹکڑوں کو رکھ کر دیوار میں نصب کر دیا۔ ۱۸۹ ہجری میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ان ٹکڑوں میں سوراخ کرا کے ان کو چاندی سے خوب اچھی طرح باہم پیوست کر دیا۔ ۳۱۷ ہجری میں قرامطہ نے مکہ پر قبضہ کر لیا اور حجر اسود کو اکھاڑ کر بحرین لے گئے۔ ۲۲ سال کے بعد یہ دوبارہ اپنی جگہ پر نصب کیا گیا اور آج تک اسی حال میں موجود ہے۔

[۵] مسلم، کتاب الاستلام۔

اگر استلام کی حقیقت اتنی ہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مرد مومن نے پہلی بار اس پتھر کو بوسہ دیا تھا، اس نے یہ عمل کیوں کیا تھا؟ ہمارے علما نے کافی غور وفکر کے بعد اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حجر اسود طواف کے آغاز واختتام کی علامت ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے۔ اس گوشہ کے تحقق سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے[۶]۔''

(سیرت النبی ۵/۳۶۷)

یہ ایک قیاسی توجیہ ہے۔ اگر حجر اسود طواف کے آغاز واختتام کی علامت ہے تو حاجی اس کو بوسہ کیوں دیتا ہے؟ اس توجیہ کی خامی محسوس کر کے بعض علما نے اس سے مختلف خیال پیش کیا ہے۔ مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''حجر اسود کو حدیث میں 'ید اللّٰہ علی الارض' (زمین پر خدا کا ہاتھ) کہا گیا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں نہیں، بلکہ تمثیلی معنوں میں ہے۔ آدمی کے اندر اٹھنے والے ربانی جذبات اپنی محسوس تسکین کے لیے یہ چاہتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاتھ کو چھوئیں اور اس کو چھو کر اپنے جذبے کو مطمئن کریں۔ حجر اسود کو چوم کر آدمی اپنے اس جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے۔''

(حقیقت حج ۴۷)

'ید اللّٰہ' کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حجر اسود عہد کی نشانی ہے۔ اگر اس کو ہم تمثیل کی زبان میں کہیں تو کہہ سکتے کہ وہ دراصل خدا کے ہاتھ کا قائم مقام ہے۔ خدا کی ذات تجسم سے پاک اور بے جہت و بے مکان ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ بندہ فی الواقع اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر کوئی عہد و پیماں کرے۔ اس لیے خدائے رحیم نے اس پتھر کو تمثیلاً اپنا ہاتھ قرار دیا، تاکہ اس کے بندے محسوس سطح پر یہ سمجھیں کہ وہ گویا اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے عہد اطاعت باندھ رہے ہیں۔ کسی فعل کے تکرار سے اس میں پختگی آتی ہے۔ خانۂ کعبہ کے ہر طواف میں حجر اسود کا استلام دراصل خدا سے باندھے ہوئے عہد غلامی کی تجدید و توثیق ہے۔ آج بھی جب دو اشخاص کوئی پختہ عہد و میثاق کرتے ہیں تو ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس بات کو ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الرکن یعنی الحجر یمین اللّٰہ فی الارض یصافح بھا خلقہ مصافحۃ الرجل أخاہ.

(مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۹۱۹)

''حجر اسود اس دنیا میں خدائے بزرگ و برتر کا دایاں ہاتھ ہے اور اس سے اسی طرح مصافحہ کیا جاتا ہے جس طرح ایک شخص اپنے بھائی سے مصافحہ کرتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ خدا سے مصافحہ کے وہ معنی نہیں جو عرف عام میں لیے جاتے ہیں۔ یہ مصافحہ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے،

۶۔ مزید دیکھیں: حجۃ اللہ البالغہ ۲:۴۴۔

دراصل عہد کا مصافحہ ہے۔ ہم جس وقت حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں:

اللھم ایمانا بك و تصدیقاً بکتا بك و وفاء بعھدك.	''اے اللہ تجھ پر ایمان کے ساتھ، تیری کتاب کی تصدیق کے ساتھ اور تجھ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے ساتھ۔''

'و وفاء بعھدك' کے الفاظ سے بالکل ظاہر ہے کہ استلام کی حقیقت وفاے عہد کا اظہار و اقرار ہے۔

استلام کی ایک قدیم مذہبی تعبیر بھی ہے۔ ماضی میں جب خدا کے نیک بندے کسی معاملے کی اہمیت ظاہر کرنا چاہتے تو عبادت کے پتھر کو گواہ بناتے تھے۔

کتاب یشوع میں لکھا ہے:

''اور یشوع نے یہ باتیں خدا کی شریعت کی کتاب میں لکھ دیں اور ایک بڑا پتھر لے کر وہیں اس بلوط کے درخت کے نیچے جو خداوند کے مقدس کے پاس تھا، نصب کیا۔ اور یشوع نے سب لوگوں سے کہا کہ دیکھو یہ پتھر ہمارا گواہ ہے، کیونکہ اس نے خداوند کی سب باتیں جو اس نے ہم سے کہیں، سنی ہیں اس لیے یہی تم پر گواہ رہے تا نہ ہو کہ تم اپنے خدا کا انکار کر جاؤ۔''

(۲۴: ۲۶۔ ۲۷)

بلاشبہ یہ پتھر روز قیامت خدا کے حکم سے گواہی دے گا کہ اس کے فلاں فلاں بندوں نے بوسہ دے کر اس کو گواہ بنایا تھا۔ بہر حال حجر اسود کو خواہ عہد کا پتھر مانیں یا شہادت کا، اعمال حج میں اس کی غیر معمولی اہمیت بالکل واضح ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ استلام کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر علما نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

عمل سعی

صفا اور مروہ کے درمیان سعی اعمال حج میں داخل ہے۔ یہ دراصل دو پہاڑیاں ہیں جو خانۂ کعبہ سے متصل ہی واقع ہیں۔ طواف کعبہ سے فراغت کے بعد ان دو پہاڑیوں کے درمیان تیز قدموں سے چلنے کو سعی کہا جاتا ہے۔ اس عمل کو حضرت ہاجرہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو پیاس سے بے تاب دیکھ کر پانی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو لے کر جب یہاں آئی تھیں، اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا۔ یہ صفا و مروہ کی سعی انھی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے[ے]۔'' (سیرت النبی ۵/ ۳۶۹)

اس خیال کی بنیاد وہ روایت ہے جو بخاری میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

ے اکثر علما و مفسرین کی یہی رائے ہے، دیکھیں تفسیر کبیر ۴/ ۱۷۶۔ حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۷۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جب کہ وہ ابھی دودھ پی رہے تھے لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زم زم نکلا، مکہ کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرب ابراہیم نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہوئے۔ وہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں: اے ابراہیم، کہاں جاتے ہو؟ اور ہمیں سنسان اور بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہ نے کئی مرتبہ کہی، مگر حضرت ابراہیم نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انھوں نے بس اتنا ہی فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں۔ حضرت ابراہیم جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹا نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انھیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

رَبَّنَـآ اِنِّـیۡ اَسۡـکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّـلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھۡوِیۡۤ اِلَیۡھِـمۡ وَارۡزُقۡھُـمۡ مِّـنَ الثَّـمَـرٰتِ لَـعَـلَّھُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ. (ابراہیم ۱۴: ۳۷)

''پروردگار میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے، پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ شکر گزار بنیں۔''

ادھر اسماعیل کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو انھیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں، آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، مگر کوئی نظر نہ آیا پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انھوں نے (صفا اور مروہ کے درمیان) سات مرتبہ کیا۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں، چپ رہ (یعنی شور مچانا بند کر) اور غور سے سننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انھوں نے کہا: اے شخص تو نے مجھے اپنی آواز تو سنا دی، لیکن کیا تیرے پاس میری مصیبت کا کوئی علاج بھی ہے؟ انھوں نے زم زم کے مقام پر ایک فرشتے کو دیکھا جو اپنے بازو سے زمین کھود رہا تھا یہاں تک کہ وہاں پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ اپنے مشکیزے کو پانی سے بھرنے لگیں، اور جوں جوں وہ پانی بھرتی گئیں پانی کی مقدار بڑھتی گئی اور وہ ابل کر اوپر آتا رہا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: اللہ اسماعیل کی ماں پر رحمت فرمائے۔ اگر وہ زم زم کو اس کی اصلی حالت میں چھوڑ دیتیں تو آج زم زم ایک بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ حضرت ہاجرہ اسی طرح چشمہ سے پانی پینے لگیں اور بچے کو بھی دودھ پلاتی رہیں۔ فرشتے نے ان سے کہا: تم کسی خوف اور اندیشے میں مبتلا نہ ہو۔ اس مقام پر اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ، دونوں مل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کر بنائیں گے، اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔'' (بخاری، رقم ۳۱۸۴)

بخاری کی یہ روایت مرفوع نہیں ہے، البتہ اس کے بعض فقرے ضرور مرفوع ہیں، یعنی ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت اصول درایت پر پوری نہیں اترتی، اس لیے غلط ہے۔ پہلے اس روایت کا وہ حصہ لیں جو غیر مرفوع ہے۔ یہ حصہ صریحاً تورات سے ماخوذ ہے۔ عبارت ذیل ملاحظہ ہو:

''ابراہیم صبح سویرے اٹھا اور روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کے کندھے سے لٹکا دیا اور انھیں گھر سے روانہ کر دیا حضرت ہاجرہ وہاں سے نکل کر بیرسبع کے بیابان میں ادھر ادھر پھرنے لگیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا۔ انھوں نے بچہ کو ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور خود تھوڑے فاصلہ پر اس خیال سے کہ بچے کو مرتے ہوئے دیکھ نہ سکیں، جا کر بیٹھ گئیں اور زور زور سے رونے لگیں۔ خدا نے بچے کی آواز کو سنا اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے حضرت ہاجرہ کو پکارا اور کہا: کیا بات ہے ہاجرہ؟ خوف نہ کرو۔ خدا نے بچہ کی آواز سن لی ہے۔ اٹھو اور بچہ کو اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لو۔ اس لیے کہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ اس کے بعد خدا نے اس کی آنکھوں کو کھول دیا اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور وہاں جا کر اس نے اپنے مشکیزے کو بھرا اور بچہ کو پانی پلایا۔'' (پیدایش ۲۱: ۱۴۔۱۹)

قارئین نے دیکھ لیا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تورات اور بخاری کے بیانات ایک سے ہیں اور دونوں میں مافوق الفطری عنصر غالب ہے۔ بخاری کی روایت میں یہ عنصر زیادہ ہے، مثلاً فرشتے کا اپنے بازوؤں سے زمین کھودنا، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے۔ اس کے غیر مرفوع حصے کا مرکزی خیال بھی محل نظر ہے۔ یعنی کم سنی میں حضرت اسماعیل کا مکہ میں آباد ہونا۔ خود اسی روایت سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ روایت میں ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم اپنی بیوی اور بچے کو وادی مکہ میں یکہ و تنہا چھوڑ کر جانے لگے تو اس مقام پر پہنچ کر جہاں بعد میں خانۂ کعبہ تعمیر ہوا، فرمایا:

رَبَّنَآ اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ. (ابراہیم ۱۴: ۳۷)	''پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔''

سوال یہ ہے کہ ابھی خانۂ کعبہ تعمیر نہیں ہوا تھا تو یہ کہنا کہ میں نے تیرے گھر کے پاس اپنی ذریت کو آباد کیا، کس طرح صحیح ہو گا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی جب خانۂ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی اور اس تعمیر میں خود حضرت اسماعیل علیہ السلام شریک تھے[8]۔

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو وادی مکہ میں اس وقت آباد کیا، جب واقعۂ ذبح پیش آ چکا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت اسماعیل دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچ چکے تھے[9]۔ علما اور مفسرین کا

۸۔ البقرہ ۲: ۱۲۷۔

بیان ہے کہ اس وقت ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سولہ برس کی تھی۔[۱۰] اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ واقعۂ ذبح کا خواب آپ نے وادی مکہ کے بجائے بیر سبع میں دیکھا تھا جہاں وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے ساتھ رہتے تھے۔ تورات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، گو کہ اس میں ذبیح حضرت اسحاق کو قرار دیا گیا ہے:

''ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اس سے کہا: اے ابرہام! اس نے کہا، میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا: اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریا کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اسحاق کو لیا اور اس سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے بتائی تھی روانہ ہوا۔ تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا۔ تب ابرہام نے اپنے نوکروں سے کہا کہ تم لوگ یہاں ٹھہرو میں اور میرا یہ فرزند وہاں جائیں گے اور عبادت کر کے لوٹ آئیں گے ... فرشتہ نے کہا: تم بچے کے خلاف ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ہم نے جان لیا کہ تو خدا ترس ہے... ابرہام نے مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے اس کی قربانی کی... تب ابرہام اپنے جوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیر سبع کو گئے اور ابرہام بیر سبع میں رہا۔''

(پیدایش ۲۲: ۱۔۱۴)

قرآن اور تورات، دونوں کے مذکورہ بیانات سے بالکل واضح ہو گیا کہ بخاری کی روایت کا غیر مرفوع حصہ یعنی حضرت اسماعیل کا کم سنی کی حالت میں مکہ میں ورود وغیرہ بالکل وضعی ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایت کے غیر مرفوع حصے کی وضعیت ثابت ہو جانے کے بعد اس کا مرفوع حصہ بھی ساقط الاعتبار ہو جاتا ہے۔ روایت میں کہا گیا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا تعلق حضرت ہاجرہ سے ہے جو اپنے بچے کی خاطر پانی کی تلاش میں ان دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑی تھیں، لیکن قرآن مجید سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔

قرآن میں صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے،[۱۱] لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ دوڑی تھیں، بلکہ اس لیے کہ واقعۂ قربانی ان پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی مروہ پر پیش آیا تھا۔ صفا کو اس سعی میں اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے مقام ذبح کو دیکھا تھا اور خدا کے حکم کی تعمیل میں تیزی کے ساتھ مروہ کی طرف دوڑ کر گئے تھے، اور پھر اسی پہاڑی پر آ کر رکے اور بیر سبع کی طرف گئے، جیسا کہ تورات کی مذکورہ عبارت

۹۔ الصافات ۳۷: ۱۰۲۔

۱۰۔ حضرت اسماعیل کا یہ کہنا: 'یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللّٰہ من الصابرین. (الصافات ۳۷: ۱۰۲) ظاہر کرتا ہے کہ وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔

۱۱۔ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللّٰہ...علیم۔ (البقرہ ۲: ۱۵۸)

سے بالکل واضح ہے۔

یہ بات کہ مروہ ہی مقام ذبح ہے، قرآن مجید اور حدیث، دونوں سے ثابت ہے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ. وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ. الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ. وَاُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ. اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ. (۲:۱۵۳۔۱۵۸)

''اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں جانتے۔ بے شک ہم تم کو آزمائیں گے، خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ان صابرین کو خوش خبری سنا دو جو مصیبت سے دوچار ہونے کے بعد بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ ہم بے شک اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ انھی لوگوں پر ان کے رب کی رحمت اور عنایتیں ہیں، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔''

ان آیات میں اللہ کی طرف سے پیش آنے والی ابتلا و آزمایش میں ثابت قدم رہنے والوں کو مژدہ سنایا گیا ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس آیت ابتلا کے فوراً بعد صفا اور مروہ کا ذکر ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کسی شخص کو صبر و ثبات کی فضیلت اور اس کے حاملین کے حق میں وعدۂ خداوندی میں شک ہو تو وہ ان دونوں تاریخی مقامات صفا اور مروہ کو دیکھ لے، جہاں اللہ تعالیٰ کے دو نیک بندوں نے عدیم المثال صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا تھا اور جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی نظر میں برگزیدہ ٹھہرے اور اس کی رحمتوں اور نوازشوں سے مالا مال ہوئے۔ 'انا كذالك نجزی المحسنين'[۱۲]۔

مابعد کی آیات سے بھی مذکورہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور

۱۲؎ تورات میں ہے:

''چوں کہ تو نے یہ بڑا کام کیا اور اپنے بیٹے کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کیا، میں تم کو یقیناً برکت دوں گا، اور تمھاری ذریت کو آسمان کے ستاروں اور سمندر کی ریت کے مانند پھیلاؤں گا، اور تمھاری نسل دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تمھاری ذریت کے واسطہ سے زمین کی تمام قومیں فیض یاب ہوں گی۔ یہ اس لیے کہ تو نے میری بات مانی اور میرے حکم کو بجالایا۔''

(پیدایش ۲۲:۱۶۔۱۸)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَالْهُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ. (البقرہ ۲: ۱۵۹)

ہدایت کو جو ہم نے نازل کی ہیں، اس کے بعد بھی کہ ہم نے کتاب میں وضاحت کے ساتھ لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں۔''

صفا اور مروہ کے ذکر کے بعد متصلاً اس آیت میں جس کتمان کی بات کہی گئی ہے، اس کا تعلق مروہ یعنی مقام ذبح سے ہے جس کو یہودی علما چھپاتے تھے۔ حدیث میں بھی ہے کہ مروہ ہی مقام ذبح ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

هذا المنهر يعني المروة و كل فجاج مكة و طرقها منهر. (موطا، رقم ۸۸۵)

''مروہ ہی قربان گاہ ہے، اور مکہ کی تمام گلیاں اور اس کے اطراف بھی۔''

مذکورہ دلائل وشواہد کی روشنی میں ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا تعلق واقعۂ قربانی سے ہے نہ کہ حضرت ہاجرہ کی بے تابانہ سعی سے جو تمام تر تورات سے ماخوذ ہے جیسا کہ تفصیل سے بیان ہوا۔

صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کی علت بھی اسی وقت سمجھ میں آتی ہے، جب ہم مان لیں کہ مروہ مقام ذبح ہے اور یہاں سات پھیرے اسی طرح لگائے جاتے ہیں جس طرح خانۂ کعبہ کے گرد لگائے جاتے ہیں جو خدا کا گھر ہے اور ابراہیمی قربان گاہ بھی۔ اس سعی کو حضرت ہاجرہ کی طرف منسوب کرنے کی صورت میں سات پھیروں کی توجیہ مشکل ہے[۱۳]۔ کیا وہ پانی کی تلاش میں دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑی تھیں؟

اس کے برخلاف سعی کو واقعۂ ذبح سے جوڑ کر دیکھیں تو اس کا مفہوم ومدعا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان حاجی کا سات بار چکر لگانا دراصل قربان گاہ اسماعیل کے گرد چکر لگانا ہے۔ اس سعی سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حاجی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح خدا کی رضا کی خاطر قربان ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

سعی کی اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حج کا یہ عمل بالکل رسمی بن گیا ہے۔ حاجی یہ سوچ کر سعی کر لیتا ہے کہ کبھی ان دو پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس دوڑ کے وقت اس کے دل کی وہ کیفیت نہیں ہو سکتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اس وقت موج زن تھی جب وہ اپنے لخت جگر کو اس مقام پر ذبح کرنے کے لیے بے تابانہ دوڑ کر پہنچے تھے۔

۱۳؎ مولانا فراہی نے اپنی تصنیف ''الرائ الصحیح فیمن هو الذبیح''میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو حضرت ابراہیم کی اس مستعدی کی طرف منسوب کیا ہے جو انھوں نے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے میں دکھائی تھی۔ یہ توجیہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انھوں نے صفا اور مروہ کے درمیان سات بار اس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا؟ صحیح بات یہ ہے کہ مروہ حضرت اسماعیل کا مقام ذبح ہے اور بایں طور اس کی حیثیت قربان گاہ کی ہے۔ چوں کہ یہ سعی اس پہاڑی کے اوپر بآسانی ممکن نہ تھی، اس لیے صفا اور مروہ کے درمیان کی قدرے ہموار جگہ پر اس کو مقرر کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وقوف عرفہ

یہ حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ حدیث میں ہے کہ: 'الحج عرفه' (عرفہ میں قیام ہی حج ہے)۔ اگر کسی نے سارے ارکان حج ادا کیے اور کسی واقعی معذوری کے بغیر وہ میدان عرفات میں حاضر نہیں ہوا تو اس کا حج نہیں ہوا۔ دوسرے ارکان حج میں گو کہ وہ متعین دنوں میں انجام دیے جاتے ہیں، اگر کسی وجہ سے تقدیم وتاخیر ہو جائے تو حج میں کوئی خرابی نہیں آتی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں قیام کے دوران میں صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور پوچھتے کہ یا رسول اللہ ہم نے ناواقفیت میں فلاں عمل پہلے کر لیا اور فلاں عمل موخر ہو گیا ہے تو آپ فرماتے: 'افعل و لا حرج ''' اب کر لو، اس میں کوئی حرج نہیں۔'' لیکن قیام عرفہ میں کسی طرح تقدیم وتاخیر کی اجازت نہیں ہے۔ ایک خاص وقت میں وہاں جمع ہونا اور ایک خاص وقت پر وہاں سے رخصت ہونا لازمی ہے۔

قیام عرفہ کے اس اہتمام والتزام کی جو وجہ علما نے بیان کی ہے، وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اکثر علما نے قیام عرفہ کو روز حشر کی ایک تمثیل قرار دیا ہے[۱۴] جو راقم کے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ حج کے سارے اعمال بیت عتیق یعنی خانۂ کعبہ سے متعلق ہیں اور خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارت ہے اور اس کو خدا کی پہلی عبادت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وادی مکہ جس میں خانۂ کعبہ واقع ہے، ایک مختصر جگہ ہے جہاں تمام فرزندان توحید کا اجتماع اور اعمال حج کی ادائیگی ممکن نہ تھی، اس لیے اس کے دائرے کو بڑھا کر عرفات تک وسیع کر دیا گیا۔ اس طرح اب منیٰ کی حیثیت قربان گاہ کی اور عرفات کی حیثیت عبادت گاہ کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں منیٰ مروہ کا اور میدان عرفات خانۂ کعبہ کا قائم مقام ہے۔ اس میدان میں اجتماعی عبادت دراصل خدا کے اصلی گھر خانۂ کعبہ میں عبادت کرنے کے مترادف ہے۔

تمام عبادات میں حج سب سے بڑی اجتماعی عبادت ہے۔ ایک ہی میدان میں، ایک ہی لباس میں، ایک ہی جذبہ و احساس کے ساتھ اہل ایمان کے ایک جم غفیر کا جمع ہونا بڑا دل کش اور اثر انگیز روحانی منظر ہوتا ہے۔ سب کی زبانوں پر خدائے قدوس کی تعریف وتمجید، اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف اور طلب مغفرت، خطاوعصیاں سے پر گزشتہ زندگی پر اظہار ندامت اور آیندہ حقیقی ایمان اور عمل صالح کی حامل زندگی گزارنے کے عزم وداعیہ کے مکرر اظہار کی خفی اور جلی صداؤں سے میدان عرفات کی پوری فضا معمور ہوتی ہے۔ خدا پرستوں کا یہ انبوہ کثیر جس وقت کامل عجز وفروتنی اور ایک خاص دلی کیفیت کے ساتھ خدا کے حضور میں گریہ وزاری کرتا اور گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو لاریب رحمت الٰہی کا سمندر جوش میں آجاتا ہے اور صدق دل سے توبہ کرنے والوں کے گناہ ضرور دھل جاتے ہیں۔

دوسری طرف اس عظیم اجتماع سے اسلام کی شان وشوکت اور مسلمانوں کے اتحاد واخوت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ میدان

۱۴۔ مولانا سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ۵/۳۷۰۔ مولانا وحید الدین خان، حقیقت حج ۶۷۔

عرفات میں امام حرم کا خطبہ اس حقیقت کا مظہر ہے۔ یہ وہی میدان ہے جہاں کھڑے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا مشہور تاریخی خطبہ دیا تھا جو اس عظیم اجتماع کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا، لیکن افسوس کہ آج حاجیوں کی اکثریت قیام عرفہ کی مذکورہ حقیقت و اہمیت سے بالکل غافل ہے۔ ایک بھیڑ ہے جو ہر سال حج کے موقع پر یہاں جمع ہوتی ہے اور گناہوں کی رسمی معافی تلافی کے بعد منتشر ہو جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

غروب آفتاب کے بعد میدان عرفات سے حاجیوں کی واپسی شروع ہوتی ہے اور مزدلفہ میں رات گزرانے کے لیے ٹھہرتے ہیں۔ مزدلفہ میں قیام کی غرض ذکر الٰہی کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاذۡکُرُوۡهُ کَمَا هَدٰىکُمۡ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ.	”پھر جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام میں ٹھہر کر خدا کو یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے تم بلا شبہ صحیح راستے پر نہیں تھے۔“ (البقرہ ۲: ۱۹۸)

دور جاہلیت میں اہل عرب عرفات سے واپسی کے بعد مزدلفہ میں قیام تو کرتے، لیکن مشعر حرام کے پاس خدا کے ذکر و عبادت کے بجائے آبا و اجداد کے مفاخر بیان کرتے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر کے اس کی جگہ ذکر خدا کی تلقین کی۔ مزدلفہ میں قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حجاج تھوڑا آرام کر لیں تاکہ دوسرے روز مستعد اور چاق و چوبند ہو کر منیٰ میں بقیہ اعمال حج انجام دے سکیں۔

قیام منیٰ

دسویں ذی الحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوتے ہیں اور تین روز یہاں قیام کرتے ہیں۔ دور جاہلیت میں عربوں نے قیام مزدلفہ کی طرح قیام منیٰ کے مقاصد کو بھی ضائع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ منیٰ میں ذکر خدا کے بجائے مختلف تفریحی مشاغل میں وقت گزارتے تھے۔ مکہ کے دوسرے بازاروں (عکاظ و ذوالمجاز وغیرہ) کی طرح یہاں بھی ایک بڑا بازار لگتا تھا جہاں اہل عرب جمع ہو کر تجارت کرتے، داد و دہش کا مظاہرہ کرتے، قربانیاں کرتے اور محفل شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔ ان محافل میں مشہور شعرا اور خطبا اپنی طلاقت لسانی اور زبان دانی کا مظاہرہ کرتے۔ ہر قبیلے کا شاعر اور خطیب اپنے اپنے قبیلہ کی شرافت و نجابت، کثرت تعداد اور شجاعت و سخاوت کے بیان میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتا جو بسا اوقات جنگ و جدل کی صورت اختیار کر لیتی۔ اسلام نے ان جاہلانہ مشاغل اور رسموں کو ختم کیا اور منیٰ کے قیام میں زیادہ سے زیادہ ذکر خدا کو لازم ٹھہرایا[15]، لیکن اس اجتماع کے دنیوی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ اجازت دی گئی کہ لوگ ذکر خدا کے ساتھ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

باہم تعارف کی مجلسیں منعقد کریں، تاکہ دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں اتحاد و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو۔

قیام منیٰ کے اعمال میں رمی، قربانی اور حلق قابل ذکر ہیں۔ ان کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

رمی جمار

قیام منیٰ کے دوران میں ایام تشریق یعنی دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو تین مختلف سائز کے ستونوں پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اسی کو اصطلاح حج میں رمی جمار کہتے ہیں۔ رمی کے بارے میں مشہور قول یہ ہے کہ ان مواقع پر شیطان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی سے باز آ جائیں۔ انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں یعنی رجم کیا۔ موجودہ رمی جمار اسی عمل کی یادگار ہے[16]۔ اکثر علما نے اسی قول کو لیا ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

> ''اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل طور پر حکم الٰہی کے اتباع کا مظاہرہ ہو سکے۔ عقل و نفس کو اس میں کسی طرح کا حظ حاصل نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس فعل کے کرنے میں حضرت ابراہیم سے تشبہ مقصود ہے، اس لیے کہ اس مقام پر ابلیس ملعون ظاہر ہوا تھا تاکہ آنجناب کے دل میں شبہ پیدا کرے یا کسی معصیت میں مبتلا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہو جائے اور اس کی (گمراہ کرنے کی) امید منقطع ہو جائے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت ابراہیم کے سامنے تو شیطان حقیقت میں ظاہر ہوا تھا اور آپ نے اس کو دیکھا تھا، اس لیے انھوں نے اس کو مارا تھا۔ میں نے شیطان کو نہیں دیکھا ہے، پھر کس لیے اس کو کنکریاں ماروں۔ اس کو جان لینا چاہیے کہ یہ شبہ بھی شیطان ہی نے پیدا کیا ہے اور اسی نے اس خیال کو تمھارے دل میں ڈالا ہے تاکہ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کا تمھارا ارادہ کمزور پڑ جائے اور تم یہ خیال کر بیٹھو کہ اس عمل سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تو محض ایک کھیل تماشا ہے، اس لیے اس میں انہماک بے جا ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم پوری دل جمعی اور ثابت قدمی کے ساتھ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کنکریاں مارو اور اپنے نفس سے اس کو دفع کرو اور یہ بھی جان لو کہ تم بادی النظر میں پتھر پر کنکریاں مارتے ہو، لیکن وہ درحقیقت شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ذلت و خواری اس عمل سے سب سے زیادہ ہوتی ہے جس میں عقل اور نفس کے لیے کوئی سامان حظ نہیں ہوتا اور صرف اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اطاعت محض کے جذبے سے انجام دیا جاتا ہے۔''
>
> (احیاء العلوم ۱/۲۴۰)

دور آخر کے علما میں مولانا حمید الدین فراہی کا خیال اس سے بالکل مختلف ہے اور وہ اس میں منفرد ہیں۔ ان کے نزدیک

۱۵؎ واذکروا اللّٰہ فی ایام معدودات. (البقرہ ۲:۲۰۳)

۱۶؎ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیم کے ہاتھ سے چھوٹ بھاگا تھا، اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ کبریٰ کے پاس اس کو سات کنکریاں ماری تھیں۔ لیکن اس روایت کا ضعف بالکل واضح ہے اور اسی لیے اکثر علما نے اس کو نظر انداز کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رمی اصحاب فیل کی تباہی کی یادگار کے طور پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیم کے وقت سے چلے آ رہے ہیں۔ عربوں نے مناسک حج انھی سے سیکھے ہیں۔ چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً وتفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ احرام، استلام، طواف، طیر حرم، صفا و مروہ، ہدی و نحر، زیارت عرفہ، وقوف منیٰ غرض خانۂ کعبہ اور حج سے متعلق ساری چیزوں کا ذکر آپ کو شعراے جاہلیت کے شعروں میں مل جائے گا، لیکن رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعۂ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے احسان کی یادگار ہے اور اس کی قدرت قاہرہ کی ایک عظیم الشان نشانی تھی اس وجہ سے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل ہو کر اس نے تکبیر و تہلیل کی ایک مخصوص سنت کی حیثیت اختیار کر لی۔''

(تفسیر نظام القرآن ۴۰۳، ۴۰۴)

مختلف سائز کے تین ستونوں پر کنکریاں مارنے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگ باری ہوئی ہوگی، اس سے ایک حد تک نقصان اٹھا کر وہ آگے بڑھنے سے رک گئی ہوگی اور حجاج نے منیٰ میں واپس آ کر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور قربانی اور تکبیر و تہلیل کے فرائض ادا کیے ہوں گے، لیکن ابھی دم خم باقی رہا ہوگا، اس وجہ سے دوسرے دن پھر مکہ پر حملہ کرنا چاہا ہوگا، لیکن حجاج نے آگے بڑھ کر پتھراؤ کر کے روک دیا ہوگا۔ یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا ہوگا یہاں تک کہ حجاج کی سنگ باری اور دست غیب کی کارفرمائیوں نے پوری فوج کو بالکل پامال کر دیا۔ چوتھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ رمی کے تین دنوں میں سے پہلے دن صرف اس ستون پر کنکریاں مارتے ہیں جو عقبہ کے پاس اور تینوں ستونوں میں مکہ سے قریب تر ہے۔ اس روز بقیہ دو ستونوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ غور کرو تو واقعہ کی فطری ترتیب کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصحاب فیل پہلے جوش میں تو مکہ کی طرف بڑھے ہوں گے اور مذکورہ حد تک پہنچ گئے ہوں گے، لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیے ہوں گے تو ان کا نشۂ جنگ تو ہرن ہو گیا ہوگا، لیکن عربوں کا جوش مدافعت مضاعف ہو گیا ہوگا اور حوصلہ بڑھ جانے کے سبب سے دوسرے دن انھوں نے اور آگے بڑھ کر مورچہ قائم کیا ہوگا۔ جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے، وہ تینوں میں سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے یہی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت گھٹا دی ہوگی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کے مقابلے میں کم ہو کر واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے۔''

(تفسیر نظام القرآن ۴۰۶)

رمی جمار کی یہ دو مختلف توجیہات ہیں جو اوپر پیش کی گئیں، لیکن راقم سطور کی نظر میں دونوں ہی توجیہات میں سقم ہے۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور صرف اس عمل (رمی) کی توجیہ کے لیے یہ گھڑ لی گئی ہے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ شیطان کو تین دن کیوں سنگ سار کیا جاتا ہے، پہلے دن صرف ایک ہی ستون (جمرۂ عقبہ) پر کنکریاں کیوں ماری جاتی ہیں، پھر کنکریاں مار کر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حاجی خانۂ کعبہ کا طواف کرنے کیوں جاتا ہے، کنکریاں مارنے کے لیے تین ستون اور وہ بھی مختلف سائز کے کیوں قائم کیے گئے ہیں، کیا شیطان بھی چھوٹا بڑا ہوتا ہے، اور کیا وہ تین کی تعداد میں حضرت ابراہیم کو بہکانے کے لیے آیا تھا، ہر بار ستون پر کنکریاں مارتے وقت تکبیر کیوں ضروری ہے، کیا خدا کے مقابلے میں شیطان اتنی بڑی قوت ہے کہ اس کی ظاہری پامالی پر اللہ کی کبریائی بیان کی جائے جو ساری کائنات کا بادشاہ ذوالجلال ہے وغیرہ؟ ان سوالات کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ بھی شیطان کی وسوسہ اندازی ہے جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جو مطابق عقل نہ ہو، خواہ کسی وجہ سے وہ ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

رمی جمرات کے بارے میں قرآن وحدیث، دونوں خاموش ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابۂ کرام اس معاملے کی اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔ وہ یقیناً رمی جمار کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال نہیں کیا، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ رمی کی اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور مذکورہ کم زور روایت نے اس کی جگہ لے لی اور صدیوں اسی روایت کے گرد ہمارا تقلید پرست ذہن گھومتا رہا۔ کسی نے تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی۔

اس سلسلے میں مولانا فراہی کا خیال بلاشبہ تحقیق پر مبنی ہے اور ان کی اس بات میں بظاہر بڑا وزن ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں تقریباً تمام اعمال حج کا ذکر ہے، لیکن رمی جمار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رمی کا تعلق بعد کے کسی بڑے واقعے سے ہے، اور وہ واقعہ اصحاب فیل کا ہے جو عربوں کے قدیم اور محترم معبد کو ڈھانے کے ارادے سے آئے تھے، لیکن غور سے دیکھیں تو مولانا کی یہ تحقیق بھی عیب سے خالی نہیں ہے۔ اس توجیہ کو قبول کرنے کی صورت میں ایک بڑا اشکال یہ سامنے آتا ہے کہ پہلے دن کی رمی کے بعد قربانی اور حلق کے اعمال کیوں انجام دیے جاتے ہیں؟ بطور شکران اعمال کی انجام دہی کا مناسب وقت وہ ہے جب دشمن کی فوج پوری طرح پامال ہو چکی تھی یعنی تیسرے دن۔ اور اس دن بھی صرف قربانی قابل فہم ہے نہ کہ حلق۔

اس کے علاوہ ابرہہ کے لشکر کی تباہی کا معاملہ بھی قابل غور ہے۔ ابرہہ کو یہ بات معلوم تھی کہ عرب محترم مہینوں میں قتال سے احتراز کرتے ہیں، اسی لیے اس نے اس موقع پر اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا تھا۔ بلاشبہ، اگر ابرہہ نے کسی اور مہینے میں حملہ کیا ہوتا تو عرب جیسی بہادر قوم اپنے قومی معبد کو آسانی کے ساتھ منہدم ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی اور وہ یقیناً جس طرح بھی ممکن ہوتا، اس کا بے جگری سے مقابلہ کرتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عربوں کی مزاحمت چنداں کارگر نہ ہوتی اور وہ ابرہہ کے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جس کی تعداد لگ بھگ ۷۵ ہزار تھی اور ہر طرح کے حربی ساز وسامان سے لیس تھا۔ جنگ خندق (غزوۂ احزاب) کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کفار عرب کی متحدہ قوت بھی دس ہزار

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ عربوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کر کے اس کا چہرہ بگاڑ دیا، حد درجہ مبالغہ آمیز بات ہے اور رمی جمرات کو اس واقعے کی طرف منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ حج کے جملہ مناسک کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی سے ہے، اس لیے رمی جمار کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ راقم کے خیال میں رمی کا تعلق ہے تو شیطان ہی سے ہے، لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جیسا کہ علما نے بتایا ہے کہ شیطان نے انسانی شکل میں آ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی سے روکنا چاہا تھا، بلکہ اس سے مراد نفس اور اس کی وسوسہ انگیزی ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اولاً گمان کیا ہوگا کہ یہ محض ایک خواب ہے، اس لیے نا قابل توجہ ہے، لیکن تکرار خواب سے وہ بہت جلد حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے اور ان کو شرح صدر ہو گیا کہ یہ خواب حقیقت پر مبنی ہے اور یہی اللہ کی مرضی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پہلے خیال پر یقیناً لاحول پڑھا ہوگا، اور پھر وہ تاریخی واقعہ ظہور میں آیا جس کے تصور سے آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ثابت کر دیا کہ وہ اللہ کے غلام ہیں نہ کہ نفس کے جس نے انھیں بیٹے کی محبت کے بہانے سے حکم خدا کی تعمیل سے روکنا چاہا تھا۔

حج کے تمام اعمال سے بالکل ظاہر ہے کہ ان سے مقصود امر الٰہی کا امتثال اور نفس کی مخالفت ہے جو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ منیٰ کے تین جمرات کا تعلق فی الواقع نفس امارہ سے ہے۔ ان پر کنکریاں مار کر جہاں حجاج اس سے اظہار برأت کرتے ہیں، وہاں اپنے اس عزم کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ جب بھی خدا کی نافرمانی کے لیے اکسائے گا تو اس کی سرکوبی وہ اسی طرح کریں گے جس طرح آج منیٰ کے میدان میں اس کو تمثیلاً زدوکوب کر رہے ہیں۔

پہلے دن کی رمی کے بعد قربانی کی جاتی ہے اور سر کے بال منڈائے جاتے ہیں جو دراصل نفس امارہ کی قربانی اور اس کے بالمقابل خدا کی فرماں برداری اور اس کی غلامی کا اظہار واقرار ہے۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ اصلی قربان گاہ خانۂ کعبہ اور مروہ موقع ذبح اسماعیل ہے، اس لیے حجاج پہلے دن کی قربانی کے بعد مکہ پہنچ کر خانۂ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی۔ اس کے بعد منیٰ واپس آ کر بقیہ اعمال حج انجام دیتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ جمرات تین کیوں ہیں اور ان کے سائز مختلف کیوں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی وسوسہ انگیزی کے کئی درجے ہیں۔ وہ ایک ہی بار اکسا کر خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے[1]۔ اس کے علاوہ نفس کی وسوسہ انگیزی باعتبار قوت مختلف ہوتی ہے۔ پہلی بار یہ سخت وشدید ہوتی ہے، لیکن مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد اس کا زور کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی بات کو تین مختلف حجم کے جمرات کی صورت میں علامتی طور پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] الناس۔

قربانی

منیٰ کے میدان میں جو قربانی کی جاتی ہے، وہ حضرت ابراہیم کی قربانی (ذبح اسماعیل) کی یادگار ہے۔ یہ دراصل نفس کی مخالفت کا انتہائی عمل ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے جانور کو شعائر اللہ کہا گیا ہے[18]۔ شعیرہ کی جمع شعائر ہے جس کے معنی نشانی (Symbol) کے ہیں۔ معلوم ہوا کہ منیٰ میں جانور کی قربانی دراصل ایک علامتی قربانی ہے۔ ہم جانور ذبح نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس امارہ کو ذبح کرتے ہیں اور اس عمل کے ذریعے سے اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری نظر میں نفس کی حیثیت جانور سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کے حکم سے سرتابی کرے گا تو اس کو اس جانور کی طرح ذبح کر دینے میں معمولی تامل بھی نہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی کام کیا تھا۔ ایک طرف اکلوتے بیٹے کی محبت تھی اور دوسری طرف خدا کا حکم کہ اس کو خدا کی رضا کے لیے اپنے ہاتھوں سے ذبح کرو۔ بڑا کڑا امتحان تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ بیٹے کی محبت جو مرغوبات نفس میں داخل ہے، خدا کا حکم بجالانے میں حارج ہوتی اور نفس حیلہ جو کے فریب میں آ کر خدا کی حکم عدولی کر بیٹھتے، لیکن وہ اس عظیم امتحان میں پورے اترے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے بندے ہیں نہ کہ نفس کے، انھیں خدا کی رضا عزیز ہے نہ کہ دنیا کی متاع چندروزہ، جو خس و خاشاک کی طرح بے وقعت ہے۔ دل کی پوری رضا کے ساتھ خدا کی کامل فرماں برداری کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ ہے جو تمام عبادات کا مقصود ہے۔ فرمایا گیا ہے:

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَ لَا دِمَآؤُہَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ. (الحج ۲۲: ۳۷)

''خدا تک نہ جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، بلکہ اس تک جو چیز پہنچتی ہے، وہ تمھارا تقویٰ ہے۔''

قربانی کی اس حقیقت سے اکثر حجاج ناواقف ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ حج تمتع اور حج قران کی صورت میں قربانی واجب ہے اور اس کا بڑا ثواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانور کی قربانی کے باوجود نفس امارہ کی سرکشی اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور زندگی کے اکثر معاملوں میں خدا کے حکم کے مقابلے میں نفس کا حکم اور اس کی خواہشات ہی غالب رہتی ہیں۔ کتنا بڑا تضاد ہے ہمارے ظاہر اور باطن میں۔

حلق راس

پہلے دن کی رمی سے فراغت کے بعد قربانی کی جاتی ہے اور سر کے بال مونڈے یا ترشوائے جاتے ہیں، اور یہی حلق ہے۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سر منڈانے کا راز یہ ہے کہ اس سے احرام سے نکلنے کا ایک ایسا طریقہ متعین ہو جاتا ہے جو وقار کے منافی نہیں ہے۔ اگر

---

[18] والبدن جعلنٰھا لکم من شعائر اللّٰہ... الخ۔ (سورۂ حج ۲۲: ۳۶)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جدا جدا راہ اختیار کرتا۔ اس کے علاوہ آشفتہ سری اور پراگندگی ختم ہونے کی علامت بھی ہے۔ اور یہ (حلق) ایسا ہے جیسے نماز میں سلام پھیرنا۔ طواف افاضہ سے قبل سر منڈانے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے، تاکہ اس کی حالت اس شخص کے مشابہ ہو جائے جو پراگندگی اور گرد و غبار کو دور کر کے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔''

(حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۵)

راقم کے خیال میں حج کے دیگر ارکان کی طرح یہ عمل بھی ابراہیمی طریقے کی یادگار ہے۔ یہودیوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو شخص خدا کی نذر کیا جاتا تھا، وہ اپنے سر کے بال اس وقت تک نہیں منڈاتا تھا جب تک کہ نذر کے دن پورے نہ ہو جاتے۔ تورات میں ہے:

''نذر کے دنوں میں اس کے سر پر استرہ نہ چلے، اور نذر کے دن جس میں وہ خود کو خداوند کے لیے علیحدہ کرتا ہے، پورے ہونے تک تقدس کے اظہار کے لیے اپنے سر کے بالوں کو بڑھائے۔'' (گنتی ۶:۶)

یہودی شریعت میں نذر کے یہ دن ساتویں روز پورے ہو جاتے ہیں اور آٹھویں روز نذر ماننے والا خیمۂ اجتماع کے دروازے پر خداوند کے لیے جانور کی قربانی پیش کرتا ہے اور خیمۂ اجتماع کے دروازے پر ہی وہ اپنے سر کے بال منڈاتا ہے۔[۱۹] ٹھیک اس قدیم طریقۂ عبادت کے مطابق جو یقیناً ابراہیم علیہ السلام کا طریقۂ عبادت رہا ہوگا، حاجی پہلے قربانی کرتا ہے، پھر بال منڈاتا ہے اور پھر مکہ جا کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے۔

حلق راس کی ایک اور حکمت بھی ہے۔ عہد قدیم میں دستور تھا کہ جو شخص غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا، اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے اور یہ غلامی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔[۲۰] حج کیا ہے؟ خدا کی غلامی اور اس کی دائمی اطاعت کا عہد و پیماں۔ اور حلق راس سے یہی مقصود ہے۔

افسوس کہ اکثر مسلمان حلق راس کی اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ حج سے واپسی کے بعد ان کے بال دوبارہ معمول کے مطابق ہو جاتے ہیں اور خدا کی غلامی کی کوئی نشانی باقی نہیں رہتی۔ ان کے اعمال سے بھی ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ وہ مکہ کی مقدس سرزمین سے خدا کی غلامی کا عہد و اقرار کر کے لوٹے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

۱۹؎ گنتی ۶:۱۳، ۱۸۔

۲۰؎ طبقات ابن سعد ۲/۳۷، سیرۃ ابن ہشام، ذکر بیر معونہ، واقعہ عمرو بن امیہ، بحوالہ سیرت النبی ۵/۳۷۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

ہمارا اخلاقی بحران

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اخلاقی بگاڑ آج ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو چکا ہے۔ امانت، دیانت، صدق، عدل، ایفاے عہد، فرض شناسی اور ان جیسی دیگر اعلیٰ اقدار کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ کرپشن اور بدعنوانی ناسور کی طرح معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ لوگ قومی درد اور اجتماعی خیر و شر کی فکر سے خالی اور اپنی ذات اور مفادات کے اسیر ہو چکے ہیں۔ یہ اور ان جیسے دیگر منفی رویے ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جس پر ہر شخص کف افسوس ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایسے میں ضروری ہے کہ اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ لے کر ان عناصر کی نشان دہی کی جائے جو ہمارے اجتماعی بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔ البتہ، اس سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی اعتبار سے اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو واضح کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اگر ہم نے اصلاح کی کوشش نہ کی تو اس کے کتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔

اخلاقی اقدار کی اہمیت

انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، لیکن ہمیں ایک لمحے کے لیے رک کر یہ سوچنا چاہیے کہ انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے والی چیز کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جانور صرف اور صرف اپنی جبلت کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کسی جانور کو بھوک لگتی ہے تو اس کے لیے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے برعکس ایک انسان زندگی کے ہر معاملے میں کچھ مسلمہ اخلاقی حدود کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ جب اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کی اخلاقی حس اسے خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے لیے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ تاہم جب انسان کی اخلاقی حس کمزور ہو جاتی ہے تو وہ صحیح اور غلط کی تمیز کھونے لگتا ہے۔ وہ ایک جانور کی طرح ہر کسی کے کھیت کھلیان میں گھس جاتا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کے سفلی جذبے آہستہ آہستہ ان پر غلبہ پا لیتے ہیں۔ جس

کے بعد انسانوں کے معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جاتا ہے اور آخر کار پوری قوم تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس تباہی کی وجہ یہ ہے کہ انسان اصلاً ایک معاشرتی وجود ہے۔ معاشرتی زندگی کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ انسان کا حیوانی وجود دینا نہیں جانتا، صرف لینا جانتا ہے۔ چاہے اس کا لینا دوسروں کی موت کی قیمت پر ہو۔ یہ اصلاً انسان کی اخلاقی حس ہے جو حقوق کے ساتھ فرائض سے بھی انسان کو آگاہ کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کا اصل حسن احسان، ایثار اور قربانی سے جنم لیتا ہے۔ جب تک اخلاقی حس لوگوں میں باقی رہتی ہے، اپنے فرائض کو ذمہ داری اور خوش دلی سے ادا کرنے والے اور ایثار و قربانی کرنے والے لوگ اکثریت میں رہتے ہیں۔ جب اخلاقی حس مردہ ہونے لگے تو ایسے معاشرے میں ظلم و فساد عام ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں پہلے معاشرہ کمزور اور پھر تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ تباہی کبھی غیر ملکی حملہ آوروں کی مرہون منت ہوتی ہے کبھی باہمی آویزشوں کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔

یہ صرف ہمارا خیال نہیں، بلکہ قوموں کی تاریخ پر نظر رکھنے والا عظیم مسلمان عالم ابن خلدون بھی ہمارے اس نقطۂ نظر کی تصویب کرتا ہے۔ وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''مقدمہ'' میں بتاتا ہے کہ دنیا میں عروج و ترقی حاصل کرنے والی قوم ہمیشہ اچھے اخلاق کی مالک ہوتی ہے، جبکہ برے اخلاق کی حامل قوم زوال پزیر ہو جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابن خلدون نے جو بات کہی ہے، آج کے حقائق بھی اسے بالکل درست ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عصر حاضر میں جو اقوام عروج و ترقی میں سب سے آگے ہیں، وہ مسلمہ اخلاقی اقدار کی پابندی میں بھی مثالی رویے کا مظاہرہ کرتی ہیں، جبکہ اہل پاکستان جیسی اقوام جو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں، وہ اخلاقی اقدار کی پابندی کے معاملے میں بھی بدترین انحطاط کا شکار ہیں۔

اخلاقی بگاڑ کے اسباب

ہمارے نزدیک اخلاقی بگاڑ انسان کا معیاری اور اصلی رویہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو دین فطرت پر پیدا کرتا ہے۔ خیر و شر کا تصور انسانی فطرت میں اس طرح راسخ ہے کہ انسان اگر نارمل حالت میں ہے تو کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یہ رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا وجود کچھ بیماریوں کا شکار ہو جائے۔ ذیل میں ہم ایک ایک کر کے ان بیماریوں کا جائزہ لیں گے۔

ا۔ دنیا پرستی

اخلاقی بگاڑ کا سب سے بنیادی سبب دنیا پرستی کی وہ لہر ہے جس میں لوگ وقتی مفاد کے آگے ہر چیز کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا جتنی حسین آج ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ خصوصاً جن سہولتوں تک ایک عام آدمی کی پہنچ آج ممکن ہے، وہ پہلے کبھی ممکن نہ تھی۔ تاہم یہ دنیا بلا قیمت دستیاب نہیں۔ اس کے حصول کے لیے مال چاہیے۔ چنانچہ مال کمانا اور اس سے دنیا حاصل کرنا اب ہر شخص کا

نصب العین بن چکا ہے، مگر یہ مال آسانی سے نہیں ملتا۔ خاص طور پر اس شخص کو جو حلال و حرام، جائز و ناجائز، عدل و ظلم اور خیر و شر کو اپنا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ ایک انسان جس کا سب سے بڑا مسئلہ مال و دنیا بن جائے، اپنے مفادات کی خاطر اخلاقی اقدار سے چشم پوشی شروع کر دیتا ہے۔ جب کبھی کوئی اخلاقی قدر حصول زر کے عمل میں رکاوٹ بنتی ہے تو وہ پر کاہ کے برابر بھی اسے اہمیت نہیں دیتا۔ رفتہ رفتہ اس کا اخلاقی وجود کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک روز دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔

انسانوں کے اخلاقی وجود کی موت کے بعد زمین فساد سے بھر جاتی ہے۔ رشوت و بدعنوانی کا باعث یہی ہے۔ ظلم و ناانصافی اسی کی پیداوار ہے۔ خیانت و بددیانتی یہیں سے پھوٹتی ہے۔ ملاوٹ و جعل سازی اسی طرح جنم لیتی ہے۔ جھوٹ اور دروغ گوئی اسی کا نتیجہ ہے۔ غرض دنیا پرستی اخلاقی زندگی کی عمارت کے ہر ستون کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہے۔ خاص طور پر نوجوان جو کسی بھی قوم کی امیدوں کا مرکز ہوتے ہیں اور بلند مقاصد کے لیے قربانی دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں، جب ان کی منزل صرف مادی منفعتوں کا حصول بن جائے تو اس سے بڑا سانحہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ساتھ یہ سانحہ بھی ہو رہا ہے۔

ہوس زر کس طرح انسانی اخلاقیات کی دشمن ہے، اس کا اندازہ اس تنقید سے ہوتا ہے جو قرآن نے قریش کی قیادت پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''لیکن یہ انسان، اس کا رب جب اسے آزماتا ہے، اور عزت بخشتا اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ اور جب اسے آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا، ہرگز نہیں، بلکہ (یہ سب تمھیں آزمانے کے لیے ہوتا ہے، مگر اس آزمایش سے بے پروا اس طرح زندگی بسر کرتے ہو کہ) یتیم کی قدر نہیں کرتے، اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور (تمھارا یہ رویہ اس لیے ہے کہ تم) مال کی محبت میں متوالے ہوئے رہتے ہو۔'' (الفجر ۸۹: ۱۵۔۲۰)

دنیا پرستی کے یہی وہ نتائج ہیں جس پر قرآن و حدیث اور انبیا کی تعلیمات میں شدید ترین تنقید کی گئی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ـــــ لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہمی فخر و مسابقت ـــــ کی مثال اس بارش کی ہے جس سے ہونے والی فصل کافروں کے دل کو موہ لے، پھر وہ پک جائے اور تم اسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اور آخرت میں ایک عذاب شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوش نودی بھی۔ اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹی ہے۔'' (الحدید ۵۷: ۲۰)

> ''لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سرو سامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو: کیا میں تمھیں ان سے بہتر چیزوں کا پتا دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن میں نہریں جاری

ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوش نودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔'' (آل عمران ۳: ۱۴۔۱۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بات کی بڑی وضاحت فرمائی ہے۔ فرمایا کہ ہلاک ہوا درہم اور دینار کا بندہ۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر دنیا کی اہمیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیتا۔ ایک اور روایت میں فرمایا کہ ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

حضرت عیسیٰ نے دولت کے فتنے کے متعلق فرمایا:

''اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔''

(متی ۱۹: ۲۳)

دنیا کی یہ مذمت اس لیے نہیں ہے کہ مال و دنیا اصلاً کوئی ناپسندیدہ شے ہے۔ یہاں مذمت مال اور دنیا کی نہیں، بلکہ ہوس زر اور دنیا پرستی کے اس فتنہ کی ہو رہی ہے جس میں مبتلا انسان ہر اخلاقی حد کو پھلانگ جاتا ہے اور یہی چیز قابل مذمت ہے۔

۲۔ منفی سوچ کا فروغ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی انحطاط کی دوسری وجہ اس منفی سوچ کا فروغ ہے جو ہمارے ہاں بعض طبقات نے عام کر دی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک مقتدر طبقات اور اشرافیہ غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ یہی ملک کے تمام مسائل کی جڑ ہیں۔ ہر فتنہ وفساد انھی سے جنم لیتا ہے۔ ان کے خیال میں ان لوگوں سے ملک کو نجات دلا دی جائے تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مسائل کی اس مقامی جڑ کے علاوہ انھیں ملک وملت کے ہر مسئلے کے پیچھے یہود وہنود اور امریکہ وروس کی سازشیں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے ساتھ دنیا بھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا واحد سبب یہی ہے کہ یہ ''کفار'' ہمارے دشمن ہیں اور ہمیں ہر میدان میں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کرنے کا اگر کوئی کام ہے تو یہی ہے کہ ان دشمنوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔

قطع نظر اس کے کہ اشرافیہ، مقتدر طبقات اور بیرونی طاقتیں کیا کر رہی ہیں اور ان کے منفی طرز عمل سے نمٹنے کا درست طریقہ کیا ہے، جب یہ روش اختیار کی گئی تو عوام کی تربیت یہ ہوئی کہ ہر خرابی کی جڑ صرف دوسروں میں ہے۔ اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دوسرے ٹھیک ہو جائیں۔ جب ایسا ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سوچ کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنی ذمہ داریاں فراموش کرنے لگے۔ ان کی توجہ اپنے دائرے میں عائد شدہ ذمہ داریوں سے زیادہ دوسروں کے اس دائرے پر ہوگئی جس پر ان کا کچھ اختیار نہیں۔ نتیجۃً لوگوں کے اپنے دائرۂ اختیار میں شر بڑھتا گیا، مگر اسے روکنے کے بجائے ان کی توجہ صرف دوسروں کی طرف مبذول رہی۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک عام آدمی نہ ملک کے مقتدر طبقات کی اصلاح کرسکتا ہے اور نہ بیرونی طاقتوں کے

خلاف لڑ کر حالات بدل سکتا ہے۔ بے بسی کے اس احساس کے تحت اس کے ذہن میں مایوسی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ مایوس آدمی ہمیشہ منفی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس مایوسی میں لوگوں نے جب حکمرانوں کو بدعنوانی کا شکار دیکھا تو اسے اپنے دائرۂ اختیار میں برائی کرنے کا جواز سمجھ کر خود کو ہر اخلاقی بندھن سے آزاد سمجھنا شروع کر دیا۔

اس طرح کی منفی سوچ کے نتیجے میں بیرونی طاقتوں کی سازشیں ختم ہوئیں نہ اشرافیہ اور مقتدر طبقات کی اصلاح ہوئی۔ صرف یہ ہوا کہ عوام الناس اپنے اوپر عائد اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرنے لگے۔ دوسروں کا ہر عیب اپنی غلطی کا ایک عذر بنتا چلا گیا۔ سسٹم کی وہ خرابی جو پہلے بالادست طبقات تک محدود تھی اب گھر گھر پھیل گئی۔

اب ہر شخص کا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے کہ میری خواہش ہے کہ ملک سے رشوت و بدعنوانی ختم ہو جائے۔ تاہم جب تک ایسا نہیں ہوتا میرے لیے رشوت لینا جائز ہے۔ سب لوگوں کو ٹریفک کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے، مگر جب تک ایسا نہیں ہوتا مجھے قانون کی خلاف ورزی کا حق ہے۔ تمام شہریوں کو اجتماعی اخلاقیات کی پابندی کرنی چاہیے، مگر جب تک ایسا نہیں ہوتا تو میں اپنے مفاد کے لیے کوئی بھی حد توڑ سکتا ہوں۔

لوگوں نے دیکھا کہ حکمران اور مقتدر طبقات کرپشن میں لتھڑے ہوئے ہیں تو انھوں نے بھی، جہاں موقع ملا، بہتی گنگا سے ہاتھ دھونا، بلکہ غسل کرنا ضروری جانا۔ انھیں کہیں انصاف نہ ملا تو انھوں نے دوسروں پر ظلم کرنے کو اپنے لیے جائز قرار دے دیا۔ اب یہی سوچ کر ایک کلرک اور کانسٹیبل رشوت لیتا ہے کہ اسے تنخواہ کم مل رہی ہے۔ یہی سوچ کر ایک دکان دار ملاوٹ کرتا اور کم تولتا ہے کہ اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اسی فکر کے پیش نظر ایک غریب دوسرے غریب کا حق اسی طرح مارتا ہے جس طرح کوئی طاقت ور کسی کم زور کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لوگوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ امریکہ، برطانیہ، اسرائیل اور بھارت کے ظلم کا رونا روتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں کے حقوق پامال کرتے جاتے ہیں۔ تیز رفتار گاڑی چلا کر لوگوں کو مار ڈالنے والے ڈرائیور، کھلے عام رشوت لینے والا ٹریفک کا سپاہی، بدعنوان سرکاری اہلکار، بددیانت تاجر اور ان جیسے دیگر جیتے جاگتے کردار امریکہ و بھارت کے بدترین ناقد بھی ہوتے ہیں۔ یہ فوج اور سیاست دانوں کی کرپشن کا گلہ بھی کرتے ہیں، مگر اپنے دائرۂ اختیار میں یہ سب اتنے ہی بڑے ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ اس ظلم کے خلاف اپنے اندر سے جو آواز اٹھتی ہے، اسے دبانے کے لیے وہ اسی منفی سوچ کا سہارا لیتے ہیں کہ اس حمام میں جہاں سب ننگے ہو چکے ہیں، ہمارے لیے بھی اخلاقیات کا لباس اتارے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس رویے کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ظلم و بدعنوانی جس کا الزام اشرافیہ اور غیر ملکی طاقتوں پر عائد کیا جا رہا تھا، اس میں تو کوئی کمی نہیں آئی، البتہ ایک عام آدمی کی زندگی اسی جیسے عام آدمی نے جہنم بنا دی ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہو چکی

ہے کہ سوسائٹی میں پھیلی بداخلاقی ،ظلم اور بدعنوانی کا شکار ہونے والے اکثر لوگ کسی بڑے آدمی کے نہیں ، بلکہ اپنے ہی جیسے عام آدمیوں کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں ۔

یہ سب نتیجہ ہے اس سوچ کا جس میں اپنی جواب دہی کے بجائے دوسروں کی جواب دہی یاد رکھی جاتی ہے ۔جس میں اپنے دائرے کے بجائے دوسروں کے دائرۂ اختیار پر زور ہوتا ہے ۔جس میں اصلاح کا مطلب صرف دوسروں کی اصلاح ہوتا ہے ، حالانکہ دین نے ہمیں جو تعلیمات دی ہیں ، وہ بالکل برعکس ہیں ۔حدیث میں بالصراحت حکم دیا گیا ہے کہ جب تمھارے حکمران برے ہو جائیں تو اسے تمھاری برائی کا سبب نہیں بننا چاہیے ۔وہ تمھارے حقوق دیں یا نہ دیں تمھیں اپنے فرائض ہر حال میں پورا کرنے ہیں ۔ان کی کمائی کا وبال ان پر پڑے گا اور تم اپنے کاموں کے ذمہ دار ہو ۔بلا شبہ یہ بات حکمت نبوی کا شاہ کار ہے جس کی خلاف ورزی کے نتائج آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر احادیث میں بھی امرا کے بگاڑ پر صبر اختیار کرنے اور اپنے دائرے میں اصلاح کرنے کا حکم دیا ہے ۔

قرآن نے یہ حکیمانہ بات اپنے انتہائی بلیغ اسلوب میں اس طرح فرمائی ہے :

> ''اے اہل ایمان تم اپنی فکر رکھو ۔اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا ، وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گا ۔اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو ۔'' (المائدہ ۵: ۱۰۵)

جہاں تک اغیار کی سازشوں کا تعلق ہے تو صحابہ کو اسی طرح کی صورت حال کے پیش آنے پر اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا تھا وہ ہم قارئین کے سامنے رکھنا چاہیں گے ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے :

> ''اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی ۔وہ جو کچھ کرتے ہیں ، بے شک اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے ۔'' (آل عمران ۳: ۱۲۰)

ان احکامات سے ظاہر ہے کہ دین کا زور اس پر ہے کہ تمھاری بنیادی ذمہ داری اپنی اصلاح ہے ۔دوسروں کا بگاڑ کبھی تمھارے بگاڑ کا جواز نہیں بن سکتا ۔اگر برائی پھیل جائے تب بھی تمھیں صبر سے کام لینا ہوگا ۔دین کے اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ جب افراد کی اکثریت اپنی اصلاح پر زور دے گی تو اس کے نتیجے میں کسی اقلیت کا بگاڑ اکثریت کے بگاڑ کا سبب نہیں بنے گا ۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عام آدمی جس کی زیادہ تر زندگی اپنے جیسے عام آدمیوں کے درمیان گزرتی ہے ، کبھی عام آدمی کے ظلم کا شکار نہیں ہوگا ۔ظلم کرنے والے طبقات بہت کم ہوتے ہیں ۔ان کی برائی کا اثر بھی محدود ہوتا ہے ، مگر جب بگاڑ عوام الناس میں پھیلتا ہے تو پوری سوسائٹی ظلم و فساد سے بھر جاتی ہے ۔ٹھیک یہی کچھ اس وقت ہمارے ساتھ ہو رہا ہے ۔

۳۔ظاہر پرستی

ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی اقدار کا شعور ہر انسان اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے ۔دنیا میں آنے والا ہر انسان ، مدرسۂ فطرت سے ، اخلاقیات کے میدان میں فارغ التحصیل ہو کر آتا ہے ۔اسی بنیاد پر قیامت کے دن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس کے اعمال کی جانچ ہوگی۔تاہم انسان اپنی بعض کمزوریوں کے باعث انحراف کا شکار ہوتے رہے ہیں۔انسانوں میں پیدا ہونے والے اس بگاڑ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے انبیا اور رسول دنیا میں بھیجے ہیں جو لوگوں کو واپس فطرت کے راستے کی طرف بلاتے ہیں۔

انبیا کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف لوگوں کی بداعمالیوں پر انھیں تنبیہ کرتے اور صحیح راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ جو لوگ ان کی بات مان لیتے ہیں، ان کو راہ راست پر رکھنے کے لیے کچھ اعمال مقرر کرتے ہیں۔یہ اعمال دین کا ظاہری ڈھانچا تشکیل دیتے ہیں۔یہ ظاہری ڈھانچا اپنی جگہ عین مطلوب ہوتا ہے،مگر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس کا اصل مقصد لوگوں کو شاہ راہ فطرت پر قائم رکھنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دین کے ہر ظاہری حکم کا کوئی نہ کوئی نتیجہ اخلاق اور فطرت کی دنیا میں نکلتا ہے۔مثلاً خدا کو تنہا معبود اور سب سے بڑا ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور سوائے اچھے عمل کے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔نماز ایک طرف خدا کی یاد ذہن انسانی میں زندہ رکھتی ہے تو دوسری طرف فواحش ومنکرات سے روکنا بھی اس کی خاصیت ہے۔روزہ اگر خدا کی نعمتوں کی قدر و قیمت کا احساس دلاتا ہے تو ساتھ ساتھ خدا کے حدود کی پابندی کی تربیت اور غربا و مساکین کے حالات کی طرف بھی انسان کی توجہ دلاتا ہے۔زکوٰۃ خدا سے محبت کے ساتھ مال و دنیا سے بے رغبتی اور ضعفا کی مدد کا بھی ذریعہ ہے۔حج وعمرہ خدا کے شوق کو بھڑکاتا ہے تو ساتھ ساتھ اس اجتماعی زندگی کی تربیت بھی کرتا ہے جس میں لوگ تکلیف دہ حالات کے باوجود اپنے اوپر قابو رکھتے اور ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔

انبیا کی یہ تعلیمات اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بے حد موثر ہیں،مگر امتوں پر جب زوال کا دور آتا ہے تو ان کی تمام تر توجہ دین کے ظاہری ڈھانچے کی طرف ہو جاتی ہے۔خدا پرستی اور اتباع شریعت کا معیار کچھ ظاہری اعمال بن جاتے ہیں۔ علامتی چیزوں کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا جاتا ہے۔دین کا ظاہری ڈھانچا جو اصلاً دین داری کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، دین کا آخری مطلوب قرار دے دیا جاتا ہے۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ دین کے اس سادہ ظاہری ڈھانچے میں لوگ اپنی طرف سے طرح طرح کے اضافے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ان کی ساری تگ ودو اور دلچسپی کا مرکز اگر کوئی چیز رہ جاتی ہے تو یہی فروعی اور اضافی چیزیں ہیں جن کی کوئی نظری یا عملی اہمیت نہیں ہوتی۔اس صورت حال کا ایک زیادہ برا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ دین کے ظاہری ڈھانچے سے حاصل ہونے والے اخلاقی نتائج کو یک سر فراموش کر دیتے ہیں۔شریعت کے احکامات سے وابستہ مقاصد جن کا ظہور اخلاقی سطح پر مطلوب ہے، وہ معاشرے کا موضوع ہی نہیں رہتے اور نہ کسی کو ان کے پیدا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔نتیجۃً لوگوں کی اخلاقی حس مردہ ہونے لگتی ہے۔لوگ دین کے تمام ظاہری اعمال کی پابندی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں،مگر عین اس کے ساتھ اخلاقی سطح پر وہ بدترین انسان ثابت ہوتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ دین کا ظاہری ڈھانچا مشکل سہی، مگر ایک دفعہ اسے اختیار کرنے کے بعد یہ انسان کی عادت میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد اس پر جمے رہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ دوسری طرف بعض لوگ اس طرح کے ظاہری اعمال پر نجات کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی شخص اخلاق کی بلند و مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ اور کرے بھی تو کیوں کرے؟ جب جنت بغیر کسی مشکل کے آسانی سے مل رہی ہے تو اخلاقیات کی اس کانٹوں بھری راہ گزر پر کون قدم رکھے جس میں قدم قدم پر اپنے اندر اور باہر لڑنا پڑتا ہے۔ چنانچہ لوگ ڈاڑھی ٹوپی، نماز روزے اور حج و عمرے کو محض رسوم کے طور پر اختیار کرتے اور اس کے بعد اپنی دانست میں اخلاقی دنیا کی ہر پستی میں اترنے کا جواز قائم کر لیتے ہیں۔ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ معاشرے میں ایک نیک مسلمان کی حیثیت سے معروف شخص بھی آج اسی اخلاقی پستی کا شکار ہے جس کا گلہ ایک دنیا دار شخص سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں خیال رہے کہ ہماری تنقید دینی عبادات پر نہیں، بلکہ ان میں غیر ضروری اضافے اور ان کے مقاصد سے بے پروائی اختیار کرنے پر ہے۔ عبادات کا یہ ظاہری ڈھانچا تو خود اللہ اور اس کے رسولوں نے مقرر کیا ہے اور بلا شبہ کسی معجزے سے کم نہیں۔

نزول قرآن کے وقت اہل کتاب نے قبلہ کی جو بحث اٹھائی تھی، اس پر انھیں تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ نیکی مشرق و مغرب کی طرف سمت کرنے کا نام نہیں، بلکہ ایمان و اخلاق کے تقاضے پورے کرنے کا نام ہے۔ ظاہر پرستی پر زیادہ تفصیلی تنقید ہمیں انجیل میں ملتی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل اپنے دور زوال میں بری طرح اس مرض میں گرفتار تھے۔ وہ معمولی ظاہری اعمال پر تو خوب زور دیتے تھے، مگر بڑے بڑے اخلاقی احکام کے معاملے میں ان پر غفلت طاری تھی۔

ایسے میں ان کی طرف سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ آپ نے جس شدت سے بنی اسرائیل کی ظاہر پرستی اور اخلاقی دیوالیے پن پر تنقید کی ہے، اسے انجیل میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم سیدنا عیسیٰ کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جس سے اس مرض کی انتہا اور اس کے بدترین اخلاقی نتائج کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی خط کشیدہ الفاظ میں ہم نے اس مسئلے کا وہ حل بھی واضح کر دیا ہے جو سیدنا مسیح نے بیان فرمایا ہے:

> ''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھتے ہو اور دکھاوے کے لیے نمازوں کو طول دیتے ہو، تمھیں زیادہ سزا ہوگی... اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی (یعنی عشر) دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو، مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیز گاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی پہلے پیالی اور رکابی کو اندر سے صاف کر تا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں بے دینی اور ریاکاری سے بھرے ہو۔'' (متی ۲۳: ۱۴۔ ۲۸)

۴۔ اجتماعی نصب العین کی غیر موجودگی

اخلاقی انحطاط کا چوتھا سبب قومی زندگی میں کسی اجتماعی نصب العین کی عدم موجودگی ہے۔ اخلاقی زندگی اصلاً قربانی کی زندگی ہے۔ انسان عام حالات میں خود پرستانہ اور ذاتی مفادات پر مبنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے، مگر جب سامنے کوئی بلند تر مقصد ہو تو انسان دوسروں کی خاطر دکھ جھیلتا اور ایثار کرتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ایک خاندان اور بچوں کے لیے ماں اور باپ کی قربانیاں ہیں۔ یہ دونوں اگر اپنے بہت سے حقوق سے دست بردار ہو کر اپنا مال، وقت اور محبت بچوں کو نہ دیں اور ان کے لیے مشکلات کا سامنا نہ کریں تو کبھی کوئی خاندان وجود میں نہیں آ سکتا۔

ٹھیک یہی معاملہ ایک معاشرے کا ہوتا ہے۔ ایک مضبوط قوم اور مستحکم معاشرہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب افراد کسی خارجی دباؤ کے بغیر خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیں۔ خاندان کے معاملے میں تو یہ چیز اس لیے با آسانی حاصل ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جبلت میں اولاد کی بے پناہ محبت ڈال رکھی ہے، مگر قوم کے معاملے میں لوگ ایسا صرف اس وقت کرتے ہیں جب ان کے سامنے اپنی ذات سے بلند تر کوئی اجتماعی مقصد اور نصب العین ہوتا ہے۔

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کوئی ایسا مقصد ہمارے سامنے نہیں۔ دوسری اقوام اس مسئلہ کو قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبے سے حل کرتی ہیں۔ ان کی زبان ایک ہوتی ہے، ان کی تاریخ ایک ہوتی ہے، ان کی تہذیب وثقافت ایک ہوتی ہے، ان کی نسل ایک ہوتی ہے، ان کا جغرافیہ ایک ہوتا ہے۔ یک جہتی کی اتنی بنیادوں کے بعد ان میں اپنی ایک انفرادی قومی شناخت کا بھرپور احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس کی بقا، تحفظ اور فروغ کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ قوم میں اجتماعی اخلاقیات کی وہ روح پیدا ہوتی ہے جس میں ہر شخص خوش دلی سے اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو بلا اکراہ وجبر پورا کرتا اور اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی مفاد کو پیچھے ڈال دیتا ہے۔

جہاں یہ بنیادیں کمزور ہوں، وہاں ان کے دانش وران میں اجتماعیت کا وہ احساس پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے مفادات ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیڈر سوسائٹی کے ہر طبقہ کے مفادات کو یکساں اہمیت دیتے اور ان کے حقوق وفرائض کے تعین میں کسی ناانصافی اور ظلم سے کام نہیں لیتے۔ جس کے بعد تھوڑا وقت گزرتا ہے اور قوم پرستی کا احساس افراد قوم کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ افراد قوم اپنی انفرادی شناخت بھلا کر خود کو اجتماعیت میں ضم کر دیتے ہیں۔ اس عمل سے نکلنے والا نتیجہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے دور جدید میں اجتماعیت کی وہ بنیادیں جن پر قوم کی بنا رکھی جاتی ہے، ہم ان

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سے محروم ہیں یا ان کو پامال کر کے ہم نے اپنے لیے وطن حاصل کیا ہے۔ آزادی کے وقت ہماری زبان، نسل، تاریخ، تہذیب وثقافت اور جغرافیہ، کچھ بھی ایک نہیں تھا۔ ایسے میں لازمی تھا اور ہے کہ ہم اپنے قومی وجود کی تعمیر کے لیے کم ازکم ایک اجتماعی بنیاد تلاش کرتے۔ جو خوش قسمتی سے اسلام کی صورت میں ہمیں پہلے ہی سے حاصل تھی۔

ایسے میں ضروری تھا کہ نعروں کے بجائے تعلیم کے ذریعے سے اسلامی تصورات کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا اور اقتدار اور حکومت کے بجائے معاشرے میں اسلام کے فروغ کو ہدف بنایا جاتا۔ بالخصوص معاشرے کے وہ فعال طبقات جو اصلاً معاشرہ کی سمت اور رفتار کو کنٹرول کرتے ہیں ان کے سامنے اسلام اور شریعت اسلامی کا درست چہرہ سامنے لایا جاتا اور ان کے ذہنوں کو اس کی علمی برتری سے مرعوب کیا جاتا۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور آج تک ایسا نہیں ہو رہا۔ اس کے بجائے فرد اور حکومت کی سطح پر چند نمایشی اقدامات اور ظاہری تبدیلی کو مطلوب قرار دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اسلام ہماری زندگیوں میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کرتا اور اس کی بنیاد پر ایک اجتماعیت کے فروغ کے امکانات دن بدن مدھم پڑتے چلے جارہے ہیں۔ مذہب کا کوئی استعمال اب بچا ہے تو ظاہر پرستی کی اس شکل میں جس پر ہم پیچھے روشنی ڈال چکے ہیں۔

ہمارے جیسی ایک تاریخی قوم جو مختلف گروہوں کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے اور جو فطری قومی بنیادوں سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بھی ایک زبردست تقسیم کا شکار ہے، اس کی بقا کے لیے ضروری تھا کہ اس کے مختلف گروہوں اور طبقات کے حقوق وفرائض کا تعین عدل وانصاف کے ساتھ کیا جاتا۔ پھر وقتاً فوقتاً ان پر نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا، مگر ہم اس میدان میں بھی مکمل طور پر ناکام رہے۔ جس کا ایک نتیجہ ہم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں بھگت لیا۔ ہم نے اپنی روش نہ بدلی تو نجانے مزید کیا کیا سامنے آئے گا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ابھی تک اپنی قومی بنیادوں ہی کو متعین نہیں کر سکے۔ کبھی سارے جہاں کا درد ہمارے دل میں سماجاتا ہے اور کبھی سب سے پہلے ہمیں اپنی جان کی پڑ جاتی ہے۔ ہم خود کو دائرۂ اسلام کا مکیں بتاتے ہیں، مگر عملاً ہمارا ہر دائرہ صوبائی سرحدوں اور لسانی حد بندیوں تک محدود ہے۔ ہمیں اپنے مسلمان ہونے پر اصرار ہے، مگر اس کے ساتھ اپنی فرقہ دارانہ شناخت پر بھی ہمیں فخر ہے۔ ہمارا قومی کلچر کیا ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ ہمارا ثقافتی چہرہ کیا ہے، ہم نہیں جانتے۔ من حیث القوم ہماری کوئی منزل نہیں۔ فی الوقت ہماری اجتماعیت مغربی، ہندوستانی اور زوال یافتہ مسلم تہذیب اور مقامی ثقافت کا ایک ایسا ملغوبہ ہے جس کی کوئی متعین شکل پچاس سال میں سامنے نہیں آسکی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے نصف صدی بعد بھی ہمارا کوئی متفقہ قومی شعور اور کلچر وجود پزیر نہیں ہوسکا۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ فرد کس قوم کے لیے انفرادی مفاد کی قربانی دے۔ یہ بات اس لیے بھی بڑی اہم ہے کہ معاشرہ صرف قانون کے سہارے نہیں چلایا جاسکتا۔ قانون تو چند مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہوتا ہے، جبکہ عام لوگ اجتماعی مفاد کی خاطر ایک روایت کے طور پر قانون واقدار کی پابندی کرتے ہیں، مگر ہمارے ہاں کسی برتر اجتماعی نصب العین کے نہ ہونے کی بنا پر لوگ اپنی ذات

اور مفاد سے آگے دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا ہمارا ہر گھر، ہر سڑک، ہر دفتر اور ہر فیکٹری اجتماعی اخلاقیات کے اصولوں کی بھرپور خلاف ورزی کا نمونہ بن چکی ہے۔

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو ہمارے اخلاقی انحطاط کے پیچھے کارفرما ہیں۔ جب تک ہم ان وجوہات کو دور نہیں کریں گے، اس وقت تک اخلاقی انحطاط کا یہ کینسر ہمیں اندر ہی اندر کھاتا رہے گا اور ایک روز ہمیں کسی بڑی تباہی سے دوچار کر دے گا۔

ہمارے نزدیک اس مسئلے کے حل کے دو پہلو ہیں۔ ایک فکری اور دوسرا عملی۔ انسان کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ حیوانات سے بلند تر ایک مخلوق ہے۔ اس برتری کا باعث قلب ونظر کی وہ صلاحیتیں ہیں جو حیوانی جبلتوں کے ساتھ اسے عطا کی گئی ہیں۔ انسان سے صادر ہونے والے تمام اعمال، خواہ وہ جبلی تقاضوں سے متعلق ہوں، قلب و ذہن کی بارگاہ سے اجازت طلب کر کے ہی دنیا میں ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ اس لیے بگاڑ جب بھی آتا ہے، وہ اولاً فکری طور پر آتا ہے اور پھر عملی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا تجزیے میں دیکھا کہ اخلاقی بگاڑ کے چاروں اسباب فکری سطح پر غلط نقطۂ نظر کے فروغ اور درست نظریہ کی عدم موجودگی سے پیدا ہوئے ہیں۔

چنانچہ اصلاح کی راہ پر پہلا قدم یہ ہے کہ ایک فکری اساس متعین کی جائے جو مذکورہ بالا اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کے ساتھ عام لوگوں کے لیے اس عملی لائحۂ عمل کی نشان دہی بھی ضروری ہے جسے اختیار کر کے وہ اس صورت حال کے خاتمے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس لیے کہ یہ اخلاقی بگاڑ عوام الناس تک سرایت کر گیا ہے اور جب تک وہ عملاً اصلاح احوال کے لیے پوری قوت سے کوشش نہیں کریں گے کسی اور کے اصلاحی اقدامات کے نتیجے میں صورت حال میں بہتری کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اصلاح کی فکری اساس

جہاں تک درست فکری اساس کا سوال ہے تو ہمارے نزدیک یہ اس مقصد کا صحیح شعور ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں مسلمانوں کو اس لیے پیدا نہیں کرتے کہ اسے کچھ نہ کچھ لوگوں کی تو بہرحال ضرورت ہے جو اس کی جنت کو ویران ہونے سے بچا سکیں۔ وہ کردار و اخلاق کا بدترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں اور اللہ تعالیٰ اس کے باوجود انھیں فردوس کے باغوں میں آباد کر دیں۔ امت مسلمہ سے جو چیز اصلاً مطلوب ہے، وہ دنیا کے سامنے ایک خدا پرستانہ معاشرے کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ پیش کرنا ہے۔ مسلمانوں کا یہ معاشرہ توحید سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ فکری اساس ہے جس کا صحیح ادراک پیدا ہونے کے بعد مذکورہ بالا چاروں منفی اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔

توحید پرست فرد دنیا پرست نہیں ہوسکتا۔اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنے رب کو راضی کرنا اور جنت کی اس ابدی بادشاہی کا حصول ہوتا ہے جس میں داخلے کی شرط یہی ہے کہ فرد اپنے وجود کو اخلاق و کردار کی ہر گندگی سے پاک کر کے اپنے رب کے حضور پیش ہو۔اس کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی خدا پرست اپنے آپ کو دنیا کی عارضی نعمتوں کی خاطر ان اخلاقی برائیوں سے آلودہ کرے جو اسے ابدی جنت سے دور کر دیں گی۔

آخرت کی کامیابی کا یہ نصب العین انسان کی نفسیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔انسان اپنے اندر ہمیشہ کی زندگی اور ابدی بادشاہی کی جو طلب پاتا ہے، جنت اور اس کی نعمتیں آخری درجے میں اسی تصور کا جواب ہیں۔ جنت کا حسن و جمال، اس کی رعنائی و دل کشی، سکون و راحت، سرور و لذت، توقیر و عزت، وسعت و رحمت، عطا و نعمت، خوشی و مسرت، آسانی و فراغت، دوام و ابدیت اور بخشش و عافیت کے تصورات جب قلب انسانی میں راسخ ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے وہ اخلاقی زندگی گزارنا بے حد آسان ہو جاتا ہے جو سرتاسر قربانی سے عبارت ہے۔ بالکل اس طالب علم کی طرح کہ کامیابی کی امید جس کے لیے امتحان کی ہر شدت کو آسان اور تیاری کے ہر مرحلے کو سہل بنا دیتی ہے۔

ایسا انسان آخرت کی اس کامیابی کے لیے شریعت پر اس کی صحیح روح کے ساتھ عمل کرتا ہے۔شریعت کا صحیح علم اسے ظاہر پرستی سے بچاتا اور دین کی ترجیحات سے آگاہ کرتا ہے۔ سچی شریعت بتاتی ہے کہ اعمال میں اصل اہمیت تعداد سے زیادہ اخلاص کی ہے۔ جزئیات سے زیادہ اصول کی ہے۔شریعت کا ہر عمل اور دین کا ہر حکم اخلاقی دنیا میں اپنا ایک نتیجہ چاہتا ہے۔ جو اگر نہ نکلے تو پھر خدا کی بارگاہ میں اس کی قبولیت مشکوک ہے۔ دین و شریعت ایک بندۂ مومن کو قدم قدم پر بتاتے ہیں کہ بندوں کے حقوق مار کر رب کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پھر جن لوگوں کی زندگی کا مقصد توحید اور اس کا فروغ ہو، وہ دوسروں کی ''سازشوں'' کے پرچار کے بجائے ان تک حق پہنچانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے فرائض انھیں یاد دلانے کے بجائے اپنی ذمہ داریاں یاد رکھتے ہیں۔ وہ ان سے دنیوی امور پر جھگڑے کھڑے کرنے کے بجائے ان کی آخرت کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ وہ نفرت کے بجائے خیر خواہی اور ذمہ داری کے اس احساس میں جیتے ہیں جو انبیا کا خاصا ہے۔ وہ لوگوں کی زیادتیاں سہہ کر انھیں اپنا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر توحید کی شکل میں قوم کو وہ اجتماعی نصب العین حاصل ہو جاتا ہے جس کے فروغ کا ارفع مقصد قوم کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ ہم جیسے بے مقصد و بے منزل گروہ کی ایک قوم بننے کی واحد امید اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ ہم توحید کے فروغ کو اپنا مشن بنا لیں۔ توحید و شریعت سے سچی وابستگی نہ صرف ہمارے اخلاقی مسائل کا حل ہے، بلکہ بے راہ روی اور دنیا پرستی پر مبنی مغربی تہذیب کو دنیا میں جو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس کے بعد ہم پر لازم ہے کہ ہم توحید اور آخرت کا مشن لے کر میدان عمل میں اتر آئیں۔ اس کو اپنے شعور میں آخری حد تک پختہ کریں اور دنیا پرستی کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو بلاشبہ ہم بارگاہ احدیت کے مجرم قرار پائیں گے۔

اصلاح کا عملی طریقہ

ہم نے پیچھے جو کچھ بیان کیا اس کے حصول کا عملی ضابطہ بھی دین نے خود ہی بیان کیا ہے۔ اصلاح معاشرہ کے اس ضابطے کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ ریاست، علما اور فرد۔ ہم اس تحریر میں صرف فرد سے متعلق دیے گئے طریقۂ کار پر گفتگو کریں گے، کیونکہ وہی ہمارا مخاطب ہے۔ نیز اس دور میں اصلاح معاشرہ سے متعلق فرد کی ذمہ داریوں کے بارے میں افراط وتفریط کا رویہ عام ہو گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں عام لوگوں پر ان کی استعداد سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے اور پھر بھی مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ اس لیے فرد کو اس کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں باشعور بنانا ضروری کام ہے۔

ایک عام فرد سے، عام حالات میں جو دینی مطالبات لازماً مطلوب ہیں، وہ قرآن کریم کی سورۂ عصر میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

''زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو ایمان لائے، اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی''۔ (۱۰۳: ۱-۳)

قرآن کریم کی یہ سورت واضح طور پر یہ بتاتی ہے مذکورہ بالا اعمال خسارے سے بچنے کا یقینی ذریعہ ہیں۔ بلاشبہ یہ خسارہ آخرت کا ہے، مگر ایک مسلمان گروہ کے لیے یہ اعمال دنیا میں بھی نجات کے ضامن ہیں۔ اس مضمون میں ایمان اور عمل صالح ہمارا موضوع نہیں۔ البتہ تواصو بالحق و تواصو بالصبر (یعنی ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور حق پر ثابت قدمی کی تلقین کرنا) کے حکم پر ہم تفصیل سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔

تواصو بالحق اور تواصو بالصبر کی اہمیت

اس حکم کی اہمیت کو جاننے کے لیے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ معاشرے میں برائیاں اس وقت پھیلتی ہیں جب لوگ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی تنہا کسی کھوہ، جنگل یا غار میں نہیں گزارتا، بلکہ لوگوں کے درمیان ایک خاندان کی صورت میں رہتا بستا ہے۔ وہ جب کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے دوست، احباب، اہل خانہ اور متعلقین اس بات سے بے خبر رہ جائیں۔ ایسے میں اس شخص کے قریبی حلقے کے لوگ اگر اس برائی کے ارتکاب پر اسے فوراً ٹوک دیں تو اس کے رجوع کرنے اور لوٹنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف اگر یہ لوگ اس کی بدعملی کو معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیں یا اس کے شریک کار اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے بن جائیں تو ایسا شخص اطمینان کے ساتھ بدترین جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جائے گا اور اسے

احساس تک بھی نہ ہو گا۔

ہمارے معاشرے میں جب ایک شخص رشوت لیتا ہے تو اکثر وبیشتر اس کے گھر والے اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اگر حرام کے اس پیسے کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، اسے سمجھائیں کہ یہ پیسہ نہیں، جہنم کے انگارے اور سانپ اور بچھو ہیں تو کسی بھی رشوت خور کے لیے اس پیسے کو گھر لے جانا بہت مشکل ہو گا۔ اس کے برخلاف جب گھر والے اپنے مفادات کی خاطر اس گناہ پر آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو معاشرے پر ایک ظالم اور بدعنوان شخص مستقل طور پر مسلط ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھی اہلکار اور ماتحت اسے روکنے کے بجائے اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہیں سے اس اخلاقی بگاڑ کا پورا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی بہت کچھ تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس پس منظر میں آپ ''تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر'' کے اس حکم کی اہمیت کو سمجھیں جس کے تحت ایک شخص جب دوسروں کو حق سے دور دیکھتا ہے تو اسے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جب کوئی فرد کسی بنا پر حق کو چھوڑنے لگتا ہے تو وہ اسے اس حق پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس حکم کا لازمی نتیجہ ہے کہ زندگی میں پہلی دفعہ رشوت لینے والے کے دوست، احباب اور متعلقین میں سے کوئی نہ کوئی اسے ٹوک دے گا۔ کسی قریبی آدمی کا برائی پر اس طرح ٹوکنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ہر شخص اپنے قریبی لوگوں میں، جن میں وہ زندگی گزارتا ہے، صاحب عزت وشرف بن کر رہنا چاہتا ہے۔ ان کی نصیحت اور فہمایش سے اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ برائی کی طرف اٹھنے والے اس کے قدم کمزور پڑ جائیں گے۔ کچھ نہ بھی ہو تو کم از کم برائی اس کی نظر میں برائی کے طور پر زندہ رہے گی۔ یہی احساس ایک دن اسے توبہ پر آمادہ کر دے گا۔

تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ایک لازمی حکم

''تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر'' کے حکم کے متعلق یہ بات جان لینی چاہیے کہ دین کا یہ حکم ایک مسلمان کی لازمی ذمہ داریوں میں سے ہے جو ایمان وعمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس ذمہ داری کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی گئی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی تشریح کرتے ہوئے ایک دوسری تعبیر بھی اختیار کی ہے جسے ہم عام طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے جانتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک دوسرے کو نیکی کی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہر صاحب ایمان مرد وعورت کا لازمی وصف ہے۔ سورۂ توبہ میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ باہم دگر بھلائی کی نصیحت کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔'' (۹:۷۱)

تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر: چند اہم نکات

دین کے اس بنیادی حکم پر عمل کرتے ہوئے چند باتیں واضح رہنی چاہییں۔ پہلی یہ کہ نماز روزے کی طرح اس حکم کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کوئی مخصوص اوقات متعین نہیں، بلکہ ایک مسلمان کو اس فریضے کی ادائیگی کے لیے ہمیشہ ذہناً تیار رہنا چاہیے۔ جب کبھی حق سے کوئی انحراف اس کے سامنے آئے تو ضروری ہے کہ وہ کسی مفاد یا اندیشہ کی پروا کیے بغیر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک وقت میں اگر ایک آدمی دوسرے کو کسی حق کی تلقین ونصیحت کر رہا ہے تو کسی اور وقت میں دوسرا پہلے کی توجہ اس کی کسی کوتاہی کی طرف دلا سکتا ہے۔ آج ایک شخص کی کسی برائی کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے تو کل یہی شخص دوسرے کو اس کی غلطی پر نصیحت کرے گا۔ اس طرح مسلم معاشرہ کا ہر شخص دین واخلاق پر عمل کرنے والا بھی بن جاتا ہے اور اس کی رکھوالی کرنے والا بھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کسی معاشرے میں برائی کو پھیلنے سے روکنے کا اس سے زیادہ موثر ذریعہ کوئی نہیں ہوسکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کام اصلاً اپنے ماحول اور حلقے میں کرنے کا ہے۔ یعنی اس کام میں انسان کا دائرۂ عمل وہ ہے جہاں وہ خود بنفس نفیس موجود ہوتا ہے۔ یعنی اس کا گھر، دفتر، دوست، محلّہ وغیرہ۔ اس میں کوئی خیر نہیں کہ ایک انسان دنیا بھر میں تو نیکی کو عام کر رہا ہو، مگر اس کا اپنا قریبی حلقہ اس کے فیض سے محروم رہ جائے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس حلقے میں بھی جو جتنا قریب ہوگا، اسی قدر یہ ذمہ داری زیادہ ہوگی۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ انسان سے سب سے قریب اس کے گھر والے ہوتے ہیں جن میں اس کے وقت کا بیش تر حصہ بسر ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے گھر والوں کی اصلاح وہدایت کے لیے انسان کو سب سے زیادہ حساس ہونا چاہیے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جس قریبی حلقے اور ماحول کو انسان کا دائرۂ عمل قرار دیا گیا ہے، وہیں اس کا ایک دائرۂ اختیار بھی ہوتا ہے۔ مثلاً شوہر کے لیے بیوی اور ماں باپ کے لیے اولاد وغیرہ۔ چنانچہ اس دائرے کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے کہ یہاں انسان اپنا اختیار استعمال کر کے ہر منکر کو روکنے کی کوشش کرے۔ یہ بات ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

> ''حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو شخص (اپنے دائرۂ اختیار میں) کوئی منکر دیکھے اس کو ہاتھ سے روک دے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' (مسلم)

اس حدیث میں طاقت رکھنے کے الفاظ اپنے اختیار کو نافذ کرنے کے حوصلہ وہمت کو بیان کر رہے ہیں۔ اس سے یہ مراد قطعاً نہیں کہ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر انسان کو طاقت استعمال کرنی چاہیے اور ایسا نہ کرے تو یہ اس کے ضعف ایمان کی نشانی قرار پائے۔ مثلاً ایک باپ کے لیے بیٹی اس کے اس دائرۂ اختیار میں ہے۔ چنانچہ اس کے کسی غلط عمل کو دیکھ کر باپ کو اسے روکنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ گھر سے باہر جسم کشا لباس پہن کر نکلتی ہے تو بیٹی کو روکنا اس کی ذمہ داری ہے۔ حدیث کا یہ حکم اس باپ سے متعلق ہے۔ اگر وہ اپنی بیٹی کو نہیں روکتا تو اپنے ضعف ایمان کا ثبوت دیتا ہے۔ اس حکم کا کوئی تعلق اس بات

سے نہیں کہ ایک عام آدمی کسی راہ چلتی خاتون کو، جس نے چادر نہ اوڑھ رکھی ہو زبردستی چادر اوڑھانے کی کوشش کرے۔ اتنی طاقت نہیں تو اسے برا بھلا کہے اور اتنی طاقت بھی نہیں تو اسے دل سے برا سمجھے اور اس حالت میں وہ کم زور ترین ایمان کا حامل ہوگا۔ اس منطق کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

چھٹی بات یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ معروف و منکر کے الفاظ سے مراد عقل و فطرت اور دین و شریعت کے مسلمات ہیں۔ مثلاً امانت و دیانت مسلمہ اخلاقی اقدار ہیں۔ جھوٹ ایک ثابت شدہ برائی ہے۔ زنا مذہب و معاشرے کی نگاہ میں یکساں طور پر جرم ہے۔ اسی طرح عبادات میں نماز مسلمہ طور پر شریعت کا حکم ہے، لیکن وہ معاملات جن پر علمی طور پر ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں، اس دائرے میں نہیں آتے۔ لہٰذا ایسے کسی معاملے میں کوئی شخص ایک نقطۂ نظر کا حامل ہونے کے باوجود اپنے حلقۂ اختیار میں اسے منوانے کا مکلّف نہیں۔ مثلاً عصر کی نماز کے وقت کے بارے میں امت میں ایک سے زیادہ آرا پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ نماز کا حکم تو زیردستوں کو دینا چاہیے، مگر وقت کے سلسلے میں کسی جبر سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ یہ کوئی دینی مسلمہ نہیں۔

ساتویں اور آخری بات یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے برخلاف جو انسان کا ذاتی فعل ہے، حق کی نصیحت اور اس پر صبر کی تاکید کا عمل چونکہ دوسروں سے متعلق ہے، اس لیے اس میں حکمت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ اس حکمت میں مخاطب کی ذہنی استعداد اور اس کی نفسیات وغیرہ کا لحاظ رکھنا بہت اہم ہے۔ اسی طرح اپنی حد کو پہچاننا اور اسی تک محدود رہنا بھی ضروری ہے۔ مخاطب کے لیے دل میں محبت و خیر خواہی کا جذبہ اور گفتگو میں نرمی اور حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کو نظر انداز کر کے جب یہ کام کیا جائے گا تو ہمیشہ الٹے نتائج پیدا کرے گا اور لوگوں کے دل میں دین کی بے وقعتی اور معاشرے میں فساد پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آخری بات

اس تحریر کے آخر میں ہم قارئین کی توجہ اسی چیز کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے جہاں سے بات کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی ہم لوگ کثرت سے اپنے معاشرے کے اخلاقی بگاڑ پر گفتگو کرتے ہیں اور اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں، مگر یہ گفتگو کرتے ہوئے ہم اکثر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہم بھی اس قوم اور معاشرے کے افراد ہیں۔ یہ صورت حال اگر پیدا ہو رہی ہے تو ہم اس پر صرف اظہار افسوس کر کے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔ یہ ہماری، مذہبی، قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور کم از کم اپنے دائرے میں غلط رویوں کے خلاف ایک جدوجہد شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں جو ہماری ذمہ داری تھی، وہ ہم نے حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ صورت حال کا ایک مکمل تجزیہ کر کے ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ مرض کیا ہے، اسباب کیا ہیں اور علاج کیا ہے۔ اب اپنے طرز عمل کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

جو لوگ اپنی قوم کے حالات سے پہلوتہی کر کے اپنی ذات میں مگن ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی تبصروں پر گزارا کر لیتے

ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ وہ خسارے میں پڑ کر رہتے ہیں۔ آج ہم یقیناً اس خسارے کا شکار ہیں۔ اس افسوس ناک صورت حال کا مشاہدہ خاندان کے ادارے سے لے کر قومی اداروں تک، ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اخلاقی معیارات کی پابندی کرنے والے لوگ اب استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم پر فرض کے درجہ میں یہ چیز لازم ہو چکی ہے کہ ہم اس صورت حال کو بدلنے کے لیے جدوجہد شروع کریں۔ اس معاملے میں اپنے لوگوں کی تربیت کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً ہمیں بدترین تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

امام احمد بن حنبل

احمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنۃ ان کے القاب ہیں۔ امام احمد ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ ان کی نشوونما بغداد میں ہوئی اور یہیں ان کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا۔ سلسلۂ نسب احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال ہے۔ شیبانی، ذہلی بصری، مروزی، اور بغدادی ان کی نسبتیں ہیں۔ امام احمد خالص عربی النسل تھے۔ ان کا خاندان بنوشیبان میں سے تھا۔ ان کے دادا امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر تھے۔ والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے، والد جوانی ہی میں وفات پا گئے۔ اس وقت امام احمد صرف تین سال کے تھے۔ ان کی والدہ نے ان کی پرورش کی۔ ان کا خاندان دنیوی وجاہت کے ساتھ علمی حیثیت سے بھی ممتاز تھا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

تحصیل علم

امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چار سال کی عمر میں انھوں نے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں اس کی باقاعدہ طلب وتکمیل میں مصروف ہو گئے۔

شیوخ واساتذہ

امام صاحب کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

حافظ ہشیم بن بشیر واسطی، امام ابو یوسف، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح، یحییٰ بن سعید، امام شافعی۔

بغداد میں انھوں نے چار سال تک مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی سے کسب فیض کیا۔ بچپن میں امام ابو یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ امام احمد کے اساتذہ میں سب سے ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعی کی ہے۔ امام شافعی فتویٰ دیتے تھے، تو اپنے شاگرد امام احمد سے بھی مشورہ لیتے تھے۔ ان کے علاوہ انھوں نے بعض اور اساتذہ سے بھی کسب فیض کیا۔

امام احمد عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے علم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے مشہور علمی مراکز کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رخ کیا اور ہر جگہ جا کر وہاں کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔ انھوں نے محدث جریر بن عبدالحمید سے حدیثیں سننے کے لیے ایران کے شہر رے میں جانے کا قصد بھی کیا تھا، مگر خرچ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہیں جا سکے۔ اس کثرت اسفار کی وجہ سے اور اپنے غیر معمولی حافظے کی وجہ سے ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

مجلس درس

چالیس سال کی عمر میں امام احمد درس و تدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ ان کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شایستہ ہوا کرتی تھی۔ لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق و مزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے۔ ابوعبیدہ بیان کرتے ہیں کہ امام احمد کی مجلس نہایت بارعب اور پروقار ہوا کرتی تھی۔ درس میں حاضرین اور شرکا کا جم غفیر ہوتا تھا۔ علماے سیر بیان کرتے ہیں کہ امام احمد کی مجلس درس میں پانچ پانچ ہزار سامعین ہوا کرتے تھے، جن میں سے پانچ سو لوگ لکھنے والے ہوتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تلامذہ

یہ امام صاحب کی جلالت علمی تھی کہ ان کے اساتذہ نے بھی ان سے کسب فیض کیا۔ امام احمد کے اساتذہ میں سے ان کے تلامذہ درج ذیل ہیں:

حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم، یزید بن ہارون۔

ہم عصروں میں سے تلامذہ

ان کے ہم عصروں کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل ہے:

احمد بن ابی الحواری، حسین بن منصور، عبدالرحمٰن بن ابراہیم، عبداللہ بن سرخسی، علی بن عبداللہ مدینی، محمد بن رافع قشری، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ، یحییٰ بن معین۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں سے امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد بلا واسطہ ان کے شاگرد ہیں اور امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ کے شاگرد ہیں۔ عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے، بے شمار ہے۔

تصنیف و تالیف

المسند جسے مسند احمد کہا جاتا ہے، ان کی بہترین تالیف ہے۔ اس میں نو سو چار صحابہ کی مسانید ہیں۔ اس کتاب کی تہذیب

سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی تھی۔اس کے علاوہ ان کی بعض دوسری تصانیف درج ذیل ہیں:

کتاب الزہد، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المنسک الکبیر، کتاب المنسک الصغیر، کتاب حدیث شعبہ، کتاب فضائل الصحابہ، مناقب صدیق اکبر وحسنین، کتاب الاشربۃ، کتاب التاریخ، کتاب التفسیر۔

علما کی شہادت

امام احمد کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے اقوال بکثرت ملتے ہیں۔امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے جب بغداد کو چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحب علم وفضل اور متدین ومتورع کوئی شخص نہیں تھا۔امام ابوثور فرماتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم وفقیہ ہیں اور وہ ہمارے شیخ وامام ہیں۔یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا۔ان کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ برا نہیں ہے۔علی بن مدینی کہتے ہیں کہ امام احمد کا اس زمانے میں وہی حال ہے، جو سعید بن مسیّب کا ان کے زمانے میں تھا۔

وفات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام صاحب نے ۷۷ برس کی عمر پائی۔۹ روز بیمار رہے۔عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔خلیفہ کو خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار مقرر کر دیے، جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے۔راستہ بند ہونے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاندتے اور امام صاحب کی زیارت کر آتے، آخری روز ایک بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا: احمد خدا کے حضور حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکل گئی اور آنسو رخسار پر ٹپک پڑے۔بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لیے کہا۔وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے۔وضو کرنے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری ہے۔تاریخ وفات میں کچھ اختلاف بھی روایت کیا گیا ہے۔امام صاحب کے جنازے میں تقریباً آٹھ لاکھ آدمی شریک ہوئے تھے۔امیر بغداد عبداللہ بن طاہر نے نماز جنازہ پڑھائی۔وفات کے بعد بھی لوگ ایک عرصہ تک قبر پر آتے اور نماز جنازہ پڑھتے رہے۔

مناقب

امام احمد بڑے بلند پایہ محدث اور ان تمام اوصاف وکمالات سے متصف تھے جو کسی امام حدیث میں ہونے چاہییں۔ ابوزرعہ رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ میں سے کوئی بھی ضبط وحفظ میں ان کے پائے کا نہیں ہے۔ انھیں لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔شہرت ونام وری اور امامت وسیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالم اسلام کا کوئی گوشہ بھی ان کے آوازۂ شہرت سے خالی نہ تھا۔

آپ عشا کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے، پھر ساری رات نماز اور یاد الٰہی میں گزارتے تھے۔ تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا۔ ہر ساتویں دن ایک قرآن ختم کر لیتے تھے۔ غربت و ناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی۔ روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید کے دوران میں قید خانے میں سحر و افطار کا اہتمام نہ ہونے کے باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے رہے۔ آپ پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، ان پانچ میں سے تین مرتبہ آپ اپنی ناداری کی وجہ سے پا پیادہ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ دنیا سے ان کی بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔

امام احمد کی زندگی میں ابتلا کا ایک ایسا دور آیا تھا جس نے ان کی عظمت کردار کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس ابتلا کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا کہ اللہ کے کلمات مخلوق ہیں یا غیر مخلوق؟ اولاً اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ تمھارا قرآن عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا کلمہ کہتا ہے، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام قرآن کے مطابق غیر مخلوق قرار پائے۔ یعنی ان کے بارے میں الوہیت کا وہ عقیدہ جو عیسائیوں میں رائج ہے، وہ قرآن کے مطابق بالکل درست عقیدہ ہے۔ اس الجھن کے سامنے آنے کے بعد حکومت نے یہ موقف سختی سے اپنا لیا کہ قرآن مخلوق ہے، یعنی اللہ کے سبھی کلمات مخلوق ہیں۔ حکومت نے یہ کوشش بھی کی کہ اسی رائے کو سب علماے امت کی تصویب حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس کی خاطر پہلے علما کو قائل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ کئی علما نے یہ موقف اختیار کر لیا۔ جن علما نے بغیر کسی شرعی دلیل کے اس موقف کو ماننے سے انکار کر دیا، ان پر پھر خوب ظلم و ستم ڈھایا گیا تاکہ وہ خلق قرآن کے قائل ہو جائیں۔

امام احمد کو اسی رائے کا قائل کرنے کے لیے طرموس سے قید و بند کی حالت میں بغداد لایا گیا۔ ان کے پیروں میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر انھیں داخل زنداں کیا گیا۔ پھر ان کو جب سزا کے لیے معتصم باللہ کے سامنے پیش کیا گیا تو پہلے درباری علما نے اور خود معتصم نے بھی ان کو عقیدۂ خلق قرآن اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اس مقصد کے لیے درباری علما نے ان سے مناظرہ بھی کیا۔ آپ اپنے مخالفین کی ساری دلیلوں کے جواب میں ایک ہی بات کہتے تھے کہ تم اپنی بات کے حق میں کتاب و سنت کی کوئی دلیل پیش کرو تو میں مان لوں گا۔ ان کی یہ استقامت دیکھ کر، جسے درباری علما ان کی طرف سے ہٹ دھرمی کا رویہ قرار دیتے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ان کو کوڑے لگانے کا فیصلہ کیا اور اس نے جلادوں کو یہ حکم دیا کہ وہ امام احمد کو کوڑے لگائیں۔

امام احمد خود بیان کرتے ہیں کہ معتصم باللہ کے حکم پر کئی جلادوں نے مجھے کوڑے لگائے۔ ہر جلاد مجھے دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا اور پیچھے ہٹ جاتا پھر نیا جلاد آتا۔ اس طرح مجھے بہت سے کوڑے لگائے گئے۔ ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہو جاتی تھی۔ جب کوڑے لگانے بند کر دیے جاتے تو میں ہوش میں آ جاتا اور دیکھتا کہ معتصم باللہ میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کہ احمد تم لوگوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے ۔ دوسرے حاضرین ان سے مخاطب ہو کر کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کر رہے ہیں اور تم ان کی بات ٹھکرا رہے ہو۔ امام احمد کہتے ہیں کہ میرے کان میں ان کی باتیں پڑ رہی تھیں، مگر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا تھا۔ میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کوئی دلیل پیش کرو، میں تمھاری بات تبھی مان سکتا ہوں ۔ اس پر مجھے زدوکوب کیا جاتا، بالآخر مار کی شدت سے میرے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہو گیا۔ اس سے خلیفہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے میری رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس فرمان کے جاری ہونے تک جلاد مجھے کل اسی کوڑے اپنے پورے زور وقوت کے ساتھ لگا چکے تھے۔ بہر حال، اس کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا۔ امام صاحب کو اس ابتلا کے دوران میں ۲۸ سے ۳۰ مہینے تک قید و بند اور محن و مشقت میں گزارنے پڑے۔

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت اور ان کی عزیمت کا غیر معمولی نمونہ تھی، ان کی شہرت و مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا۔ امام صاحب کے دوسرے اوصاف و کمالات میں تو اور لوگ بھی ان کے شریک و سہیم ہیں، لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انھی کے حصے میں آئی ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد احسن تہامی

جناب ماجد خاور کی وفات

جناب خالد مسعود کی رحلت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ برادرم ماجد خاور بھی رخصت ہو گئے۔ درحقیقت ہم سب بھی اسی منزل کی طرف رواں دواں ہیں جہاں ہمارے یہ پیش رو پہنچ چکے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جناب خالد مسعود کی یاد میں ریفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ماجد خاور صاحب کہہ رہے تھے کہ خالد مسعود کے ساتھ میری دوستی اور تعلق چار دہائیوں پر محیط ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوست کے رخصت ہونے کے بعد وہ چار مہینے بھی اس جہان فانی میں نہ گزار سکے۔

اس دوستی کا آغاز ''تدبر قرآن'' سے ہوا۔ خالد مسعود صاحب چار برس تک تنہا مولانا اصلاحی کے شاگرد رہے۔ حلقہ قائم ہوا تو جناب خالد مسعود کو مزید ہم سبق میسر آئے۔ ماجد خاور اور خالد مسعود کو مولانا اصلاحی کی شاگردی اور استاد کے افکار و نظریات کی ترتیب واشاعت نے باہمی اخلاص کے بندھن میں ایسا باندھا کے پیغام اجل ہی ان کی جدائی کا باعث بن سکا۔

جناب ماجد خاور کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ استاد کی زندگی کے ایک نہایت مشکل مرحلے میں انھوں نے اللہ کے بھروسے پر ''تدبر قرآن'' جیسی کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور سچی بات یہ ہے کہ کسی تجربے کے بغیر انھوں نے اس کام کا حق ادا کر دیا۔ ''تدبر قرآن'' سے پہلے مولانا اصلاحی نے جو علمی کام کیا تھا، اسے جناب ماجد خاور قرآن وسنت کے طلبہ تک پہنچاتے رہے اور ''تدبر قرآن'' کی تکمیل کے بعد استاد کے ملفوظات کو ٹیپ کے ذریعے سے محفوظ کرنے اور ان کی ترتیب و تدوین کرنے کے بعد ان کی اشاعت کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے۔

پچھلے آٹھ دس برس سے برادرم ماجد خاور کے ساتھ میرا ایک کاروباری تعلق بھی تھا۔ ''فاران فاؤنڈیشن'' کی مطبوعات کے تقسیم کار کی حیثیت سے میں نے انھیں کاروباری معاملات میں نہایت دیانت دار اور کھرا شخص پایا۔ لین دین اور قرض اور ادھار کے معاملات میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ ان چیزوں سے بھی گریز کرتے تھے جو شرعی طور پر بالکل جائز ہیں اور کاروباری معاشرے میں ان کا چلن عام ہے۔ ان کی اس احتیاط کے باعث ان کے بہت سے کاموں میں تاخیر ہو جاتی تھی،

لیکن انھوں نے اپنے لیے معاملات کا جو معیار پہلے دن طے کیا تھا، زندگی کے آخری مرحلے تک اسی پر قائم رہے۔ تقویٰ اور دیانت کو کسی بڑے سے بڑے مفاد کے لیے بھی انھوں نے قربان نہیں کیا۔ درحقیقت امام فراہی اور امام اصلاحی نے تقویٰ اور دیانت کا جو معیار اس زمانے میں قائم کیا تھا، خالد مسعود اور ان کے دوست ماجد خاور، دونوں نے اس کی پیروی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس دنیا میں انھوں نے پوری شان اور وقار کے ساتھ دین کی خدمت کی اور جائز اور حلال ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدن پر اکتفا کیا۔ امام حمید الدین فراہی کو علما کی گدایانہ روش سے جو کراہت تھی، اس کے اثرات مولانا اصلاحی کی صحبت نے ان کے شاگردوں تک منتقل کر دیے۔ برادرم ماجد خاور کی زندگی بھی استغنا اور خودداری کی اسی روش کی ایک مثال تھی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرمادے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معظم صفدر

”قبول حق کے بعد“

مصنف: نعیم احمد بلوچ،

ضخامت: ۲۲۴،

قیمت: ۱۵۰ روپے،

ناشر: دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انسانی تاریخ میں صحابۂ کرام نے حق پرستی کی ناقابل فراموش داستانیں رقم کی ہیں۔ حق سامنے آ جانے کے بعد اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور ظلم وستم سہہ کر بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑنے کی جو مثالیں انھوں نے قائم کی ہیں، وہ حق پسندوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آوازۂ حق پر لبیک کہتے ہوئے نہ زمانے کی پروا کی، نہ مصائب سے خوف کھایا اور نہ مال و دولت اور اعزہ واقربا کی محبت سے مغلوب ہوئے، بلکہ نہایت عزم و استقلال کے ساتھ آپ کی پیروی میں جادۂ حق پر گام زن رہے اور اس شان سے گام زن رہے کہ پروردگار نے دنیا ہی میں انھیں اپنے راضی ہونے کی خوش خبری سنا دی۔ جس ہستی کی اطاعت میں کھڑے ہوئے، اس نے انھیں ستاروں کے مانند قرار دیا اور عامۃ الناس کے لیے ان کی پیروی کو کامیابی کی ضمانت قرار دیا۔ تاریخ میں ان کی عظمت اور عزیمت کی داستانیں محفوظ ہیں۔ انھیں پڑھ کر ہر خردمند یہ پکار اٹھتا ہے کہ:

وہ حق کی، صداقت کی تصویر تھے
وہ انساں کے خوابوں کی تعبیر تھے

زیر تبصرہ کتاب ”قبول حق کے بعد“ میں بارہ صحابۂ کرام کی داستان عزیمت بیان کی گئی ہے۔ ان کے اسماے گرامی یہ ہیں: سیدنا ابوذر غفاری، سیدنا سعید بن عامر، سیدالشہدا حمزہ بن عبدالمطلب، سیدنا عمیر بن وہب، سیدنا بلال، سیدنا سلمان فارسی،

سیدنا زید بن حارثہ، سیدنا عدی بن حاتم، سیدنا عکرمہ بن ابی الحکم، سیدنا صہیب رومی، سیدنا عمرو بن جموح، سیدنا سراقہ بن مالک۔

مصنف نے صحابہ کے ایمان افروز واقعات اور قبول حق کے پس منظر کو شخصیت پرستی اور مافوق الفطرت واقعات کی روایتی ڈگر سے ہٹ کر تاریخی حقائق کی بنیاد پر بیان کیا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم اخروی زندگی میں کامیابی کے تمنائی تھے۔ وہ دنیوی مال ومتاع کو اپنا ہدف نہیں بناتے تھے۔ بعض صحابہ کا معاملہ اسباب دنیا سے کامل بے رغبتی کا تھا۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی اسی بے رغبتی کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''مسیح الاسلام'' کا لقب دیا تھا۔ ان کے حوالے سے مصنف بیان کرتے ہیں:

''مدینہ میں مسلمانوں کے سیاسی حالات کے ساتھ اقتصادی حالات بھی بتدریج بہتر ہوتے گئے، لیکن ابوذر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ چونکہ اپنا بیش تر وقت مسجد نبوی میں گزارتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سے زیادہ دین سیکھنے اور اپنی تربیت کرنے کی فکر میں رہتے اس لیے ان کی مالی حالت اچھی نہ رہی۔ دراصل وہ کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے اگر دنیا کو چنا ہے تو میں نے آخرت کو اور فقر کو اختیار کیا ہے۔'' (۱۷)

مصنف نے سید الشہدا حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شفقت ومحبت کو نہایت احسن انداز سے بیان کیا ہے۔ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت تھی اور یہی محبت ان کے قبول اسلام کی بنیادی وجہ بھی بنی۔ ان کے قبول اسلام سے مظلوم مسلمانوں کو بہت تقویت ملی:

''حضرت حمزہ کے ایمان لانے سے قبل مسلمان علانیہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے واضح اعلان کر دیا کہ اگر کسی نے مسلمانوں کے راستے میں آنے کی کوشش کی تو وہ براہ راست ان سے دشمنی مول لے گا۔ ان کی اس للکار کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔'' (۴۶)

زیر تبصرہ کتاب میں داستان کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پڑھتے ہوئے ان کا کردار افسانوی محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک ایسا ہیرو جس کو قدم قدم پر مشکلات درپیش ہیں، لیکن وہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ سیدنا سلمان فارسی ایک نہایت متمول اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن حق کی جستجو میں انھوں نے بہت زیادہ مصیبتیں جھیلیں۔ ایران سے عرب تک کے سفر میں انھوں نے پے در پے دھوکے کھائے، ظلم سہے، لیکن حق کی طلب کے جذبے نے انھیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ وہ حق کی جستجو میں اپنا سب کچھ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے:

''ایک دن ایک شخص نے مابہ (سلمان فارسی رضی اللہ عنہ) کو بتایا کہ ایک عرب قبیلے کا تجارتی قافلہ عموریہ میں ٹھہرا ہوا ہے اور جلد ہی عرب کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ مابہ نے اس قافلے کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ یہ بنی کلب کا قافلہ ہے۔ مابہ نے قافلے کے سردار سے بات کی اور کہا: ''مجھے عرب کی سرزمین جانا ہے، اگر تم مجھے وہاں پہنچا دو تو میں تمھیں اپنے سارے جانور دینے کو تیار ہوں''۔'' (۱۴۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتاب میں طویل ترین داستان عزیمت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی ہے۔ قبول حق کے بعد جس قدر انھوں نے مشکلات برداشت کیں اور اس پر جس درجے کی استقامت اختیار کی، بلاشبہ یہ انھی کا خاصا ہے۔ ان کی ثابت قدمی اس درجے میں پہنچ گئی کہ اس کے مقابلے میں ظالموں کی ہمت جواب دے گئی:

''... اگلا دن بلال رضی اللہ عنہ کے لیے پہلے دن سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ پورا دن انھیں کسی بے جان پتلے کی طرح گھسیٹا اور رگیدا گیا۔ ان کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کو مارنے والے، ستانے والے، گالیاں بکنے والے تھک جاتے، اکتا جاتے، مگر بلال رضی اللہ عنہ تو یوں دکھائی دیتے کہ وہ ایک پہاڑ ہیں جسے لوگ ہلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ ایک دو روز نہیں کئی دن جاری رہا اور ایک دن تنگ آ کر امیہ نے ابوجہل سے کہا: ''اے ابوالحکم، ہم نے اس غلام کو طرح طرح کی سزائیں دی ہیں، لیکن نہ جانے یہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس کی استقامت تو الٹا ہماری بے عزتی کا باعث بن رہی ہے''۔'' (۹۲)

زیر تبصرہ کتاب میں شامل زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی داستان صحابۂ کرام کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت کی نہایت روشن مثال ہے۔ سیدنا زید ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھیں بچپن میں ڈاکووں نے اغوا کر کے غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا تھا۔ وہ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے رسول اللہ کے پاس پہنچے تھے۔ گھر والوں نے ان کی تلاش میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بالآخر ایک روز انھیں اطلاع ملی کہ ان کا بیٹا غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ فوراً ان کے مالک کے پاس پہنچے اور اپنے بیٹے کی آزادی کے بدلے منہ مانگی رقم کی پیش کش کی۔ مالک نے رقم لینے سے انکار کر دیا اور آزادی کا اختیار اپنے غلام کو دے دیا۔ غلام نے آزادی پر غلامی کو ترجیح دی اور اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر باپ کا دکھ اپنی جگہ صحیح تھا، لیکن زید کی مجبوری بھی غلط نہ تھی۔ اس موقع پر باپ اور بیٹے میں جو مکالمہ ہوا، اسے مصنف نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''اے زید تم پر افسوس! تم غلامی پر آزادی کو قربان کر رہے ہو؟ خدا کی قسم، تمھاری تلاش میں کون سا ایسا پتھر ہوگا جو میں نے نہ الٹا ہوگا اور اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم ان صاحب کو نہیں چھوڑ سکتے، اپنے باپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔

اے والد محترم، آپ نے درست فرمایا، لیکن میں نے ان صاحب کی ذات میں جو کچھ دیکھا ہے، ان کو جس طرح کا خوب پایا ہے، اس کے بعد یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں انھیں چھوڑ دوں۔'' (۱۵۴)

زیر تبصرہ کتاب دراصل تاریخ عالم کے ایک نہایت اہم باب کو بیان کر رہی ہے، لیکن مصنف نے دیگر تاریخی کتب کی طرح علمی اسلوب کے بجائے داستان کے پیرائے میں بالکل عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات پر تو ان کے مخاطبین کم عمر طلبا محسوس ہوتے ہیں جن کی تفہیم کے لیے بات کو سادہ ترین الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے زیادہ تر ایسے صحابۂ کرام کی داستان عزیمت کا انتخاب کیا ہے جو ہمارے ہاں بالعموم معروف نہیں ہیں۔ کتاب کا فونٹ سائز مناسب استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں پروف کی غلطیاں موجود ہیں۔ سرورق موضوع کے اعتبار سے سنجیدہ اور پروقار ہے۔

خیال و خامہ

جاوید

ہم نے مانا کہ یہاں اب کوئی بیداد نہیں
دیکھتے ہو کہ کسی لب پہ بھی فریاد نہیں

زخمہ ور ، شوکت پرویز کا نغمہ ہر سو
ہر طرف جشن کہ اب شہر میں فرہاد نہیں

سگِ آوارہ تو بستی میں کھلے ہیں ، لیکن
حادثہ یہ ہے کہ پتھر کوئی آزاد نہیں

اب تو فردوسِ تخیل میں بھی مشکل ہے کہ ہو
وہ نشیمن کہ جہاں گھات میں صیّاد نہیں

راہِ تقلید نہیں ، دونیِ ہمت ہے فقط
وہ سفر کیا ہے جسے خطرۂ افتاد نہیں

ہر نفس زندہ و بیدار عنایت اس کی
تم اسے یاد ہو ، پر تم کو خدا یاد نہیں

دشت و صحرا ہی سے نسبت ہے تجلّی کو اگر
دل کا ویرانہ بھی غرناطہ و بغداد نہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org